Majallah-e-Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 31, Sr.No.80, 2010, pp 53 - 98

مجلہ تحقیق
مجلۂ کلیۂ علوم شرقیہ
جلد ۳۱، جولائی۔ستمبر ۲۰۱۰ء، شمارہ ۸۰

اردو تنقید آغاز و ارتقاء

ڈاکٹر ضیاء الحسن☆

Abstract:

Urdu Criticism started from Muqqadama-e - Sher - o - Shaeri which was published in 1993. It was the wisdom of Sir Syed Ahmad Khan which guided the initial Urdu critics toward the path of change in life and literature. Moulana Altaf Hussain Hali Moulana, Shibli Naumani, Moulana Muhammad Hussain Azad and Sir Syed Ahmad Khan himself are the four pillars of new palace of Urdu Criticism. They drew the rules of new criticism in Urdu Literature.

علی گڑھ تحریک سے قبل تنقید نگاری تذکرہ نگاری کی صورت میں ملتی ہے۔ اسے ہم تنقید تو نہیں البتہ تنقید کے اولین نقوش قرار دے سکتے ہیں۔تنقید کے حوالے سے خود سرسید کے ہاں تو کوئی بہت زیادہ کام نظر نہیں آتا لیکن حالی، شبلی اور آزاد کے کام کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، اورینٹل کالج، جامعہ پنجاب، لاہور۔

علی گڑھ تحریک کے اثرات صرف سرسید کے رفقا پر ہی نہیں ہوئے بلکہ بہت سے ایسے ادیب جو اس تحریک سے براہ راست منسلک نہیں تھے اس سے متاثر ہوئے۔ سید احمد دہلوی کی ''رسوم ہند'' سید علی بلگرامی کے تراجم' امداد امام اثر کی تنقید پر اس تحریک کے اثرات واضح طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس تحریک کی مخالفت میں بھی بہت کچھ لکھا گیا۔ مخالف نقطۂ نظر رکھنے والوں میں مولوی علی بخش شرر' سید امداد علی' سجاد حسین' مچھو بیگ ستم ظریف' سید محمد آزاد اور اکبر الہ آبادی کے نام نمایاں ہیں۔ ان میں سے کچھ حضرات نے سنجیدگی سے سرسید کے نظریات کی مخالفت کی اور بعض نے ظرافت کے رنگ میں اس تحریک کا مضحکہ اڑایا۔ علاوہ ازیں مذہبی حوالے سے بھی اس تحریک کی مخالفت میں علماء کا ایک پورا گروہ نظر آتا ہے جو سرسید کے مذہبی نظریات سے خصوصاً اختلاف رکھتا تھا۔

علی گڑھ تحریک کا بنیادی مقصد ادب کی اصلاح و ترقی نہیں تھا۔ سرسید اور ان کے رفقا نے ادب مسلمانوں کی اصلاح کے وسیلے کے طور پر اختیار کیا لیکن اس تحریک نے اردو ادب کے دامن کو وسیع کیا۔ اردو ادب میں نثر کے حوالے سے جو بھی ترقی ہوئی اس میں اس تحریک کا بنیادی حصہ ہے۔ شاعری کے حوالے سے بھی انقلابی تبدیلیاں آئیں اور شاعری کو قوم کی اصلاح کے لیے استعمال کیا گیا۔ اس حوالے سے حالی کی مسدس خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ شاعری کے موضوعات' اصناف اور اسلوب ہر سطح پر تبدیلیاں آئیں۔ نثر کے حوالے سے بھی نئی نئی اصناف اردو ادب میں شامل ہوئیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

> ''یہ تبدیلی ایک نشاۃ الثانیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر اس تحریک تک کوئی تحریک پہنچتی ہے تو وہ یورپ کی نشاۃ الثانیہ (Renaissance) کی تحریک ہے۔ سرسید نے اس تحریک کے متعلق خیالات کو تحریر و تقریر دونوں کے ذریعے عام کرنے کی کوشش کی چنانچہ ادب بھی ان خیالات سے متاثر

ہوا-(۱)''

سرسید احمد خان سے دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے- پہلا دور ۱۸۵۷ء سے قبل اور دوسرا دور ۱۸۵۷ء کے بعد کی تنقید کا- اگر چہ سرسید احمد خان کا وہ کام جس کی بنیاد پر وہ بیسویں صدی کے سب سے بڑے مسلمان دانشور اور ادیب تسلیم کیے جاتے ہیں- ۱۸۵۷ء کے بعد کا ہے لیکن ان کے ابتدائی کام کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس میں آثار الصنادید جیسی وقیع کتاب بھی شامل ہے-

سرسید احمد خان نے ۱۸۴۷ء میں اپنے زمانے کے مختلف علوم وفنون کے ماہرین کا ایک جامع تذکرہ مرتب کیا- یہ ان مشاہیر کا تذکرہ ہے جو اپنے زمانے میں کسی نہ کسی حیثیت سے معاشرے میں اہم مقام رکھتے تھے- ان میں سے اکثر بزرگ ایسے ہیں جن کا ذکر صرف اسی تذکرے میں ملتا ہے اور اگر سرسید نے ان کا حال تحریر نہ کیا ہوتا تو آج ہم ان کے نام تک سے واقف نہ ہوتے- اس تذکرے کے حوالے سے محمد اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں:

> ''اس تذکرے کو مرتب اور مدون کرنے میں سرسید کو دوڑ دھوپ' تگ و دو اور سعی و کوشش کرنی پڑی ہوگی اور حالات و واقعات کی تلاش میں کس کس کی خوشامد نہ کرنی پڑی ہوگی' جب جا کر یہ بے نظیر تذکرہ مرتب ہوا ہوگا- اس میں سرسید نے دس قسم کے ایسے کملائے عصر کے سوانحی حالات جمع کیے تھے جو اپنے اپنے فن میں اپنے زمانے میں یکتائے عصر تھے اور جن کا مثل دہلی کی خاک سے پھر پیدا نہ ہو سکا- اس تذکرے میں کل ۱۱۹ لوگوں کا حال تھا-(۲)''

یہ تذکرہ انھوں نے ''شاہجہان آباد کے لوگوں کا بیان'' کے عنوان سے اپنی مشہور کتاب ''آثار الصنادید'' کے آخر میں لگایا تھا جس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا- لیکن دوسرے

ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۵۴ء میں اس تذکرے کو کتاب سے خارج کر دیا- محمد اسماعیل پانی پتی نے اسے مقالات سرسید جلد شانزدہم میں شامل کیا ہے- اس میں دہلی کے شعراء کا تذکرہ بھی شامل ہے جو ۱۲۳ صفحات پر مشتمل ہے جس میں انھوں نے سترہ شعرا کے حالات درج کیے ہیں-

سرسید احمد خان کو شعر و ادب کے بارے میں اپنے خیالات و نظریات کو باقاعدہ شکل میں ترتیب دینے کا موقع نہیں مل سکا- لیکن وہ پہلے ادیب ہیں جنھوں نے ادب کے مسائل پر سنجیدگی سے سوچا- اپنے زمانے کے ادب کی خامیوں اور خرابیوں کی طرف توجہ دلائی اور ان سے بچنے کی راہیں ہموار کیں- سرسید کے تنقیدی نظریات پر ان کے عہد کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں- یہ عہد ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ہر لحاظ سے زوال کا ایک مشکل عہد تھا اور سرسید مسلمانوں کو اس مشکل سے نکالنے کے لیے ایک جہد مسلسل میں مصروف تھے- وہ ادب کو فلسفیانہ موشگافیوں اور حصول مسرت تک محدود نہیں دیکھ سکتے تھے بلکہ اسے ملک و ملت کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے- انھوں نے اردو کے شعری و نثری ادب پر تنقیدی نگاہ ڈالی تو اسے زندگی کے مسائل و معاملات سے بے پروا دیکھا- شاعری عشقیہ و صوفیانہ مسائل تک محدود تھی- زندگی کی تلخ اور ٹھوس حقیقتوں سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا- مبالغہ آرائی کی وجہ سے شعر کی دنیا ایک چیستاں بن کر رہ گئی تھی- سرسید نے شاعری کی اس خامی کی طرف شاعروں اور نقادان ادب دونوں کی توجہ دلائی- ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''لیاقت شاعر کی یہ ہے کہ وہ نہایت بڑے استاد مصور کی مانند ہو کہ وہ اصل صورت اور رنگ اور خال و خط کو بھی قائم رکھتا ہے اور پھر بھی تصویر ایسی بناتا ہے کہ خوش نما معلوم ہو- ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ اس بات کا خیال نہیں رکھتے بلکہ جس کی تعریف کرتے ہیں اس کے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں جن کے سبب سے وہ تعریف تعریف

نہیں رہتی بلکہ فرضی خیالات ہو جاتے ہیں۔(۳)''

مندرجہ بالا اقتباس ان کے کسی تنقیدی مضمون سے نہیں لیا گیا بلکہ خوشامد کی مذمت میں لکھے گئے ان کے مضمون کا حصہ ہے لیکن اس سے ان کے نظریہء شعر کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ سرسید احمد خاں مبالغہ آرائی کو بہت برا جانتے تھے۔ اس کی مذمت میں انھوں نے مختلف مضامین میں مختلف پیرایوں میں اظہار خیال کیا ہے۔ سرسید احمد خاں عقل پرست انسان تھے۔ ان کے تمام علمی و ادبی کام سے عقل پرستی کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے مذہب کو بھی خالص عقل سے پرکھا۔ ان کی تفسیر القرآن پر ہونے والے تمام تر اعتراضات کا باعث ان کی عقلیت پسندی ہے۔ ڈاکٹر آغا افتخار حسین نے بجا طور پر سرسید احمد خان کو برصغیر میں عقلیت پسندی کا اولین رہنما قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''آخر کوئی سات سو سال تک عقلیت، کی مخالفت کے بعد ہندوستان میں ایک بار پھر عقلیت پسندی کی تحریک نمودار ہوئی۔ اس تحریک کی ابتدا سرسید احمد خان نے کی۔(۴)''

اس عقلیت پسندی سے انھوں نے اردو ادب کا جائزہ لیا تو اسے زندگی سے بہت دور پایا۔ سرسید نے اپنی کوششوں سے اس جامد ادب میں زندگی کا تحرک پیدا کیا اور اسے انسانیت کی فلاح و اصلاح کے قابل بنایا۔ صنائع بدائع اور علم بیان شعر و ادب کے جمالیاتی حسن میں ضرور اضافہ کرتا ہے لیکن اس کی عام فہمی میں رکاوٹ بنتا ہے۔ اسی لیے سرسید براہ راست اظہار کے قائل تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شعر میں تاثیر جذبہ و احساس اور خلوص سے پیدا کرنی چاہیے نہ کہ مبالغہ سے۔ وہ چاہتے تھے کہ شاعری سے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنے کا کام لیا جائے۔ انھوں نے نیچرل شاعری کی پرزور حمایت کی۔ نیچرل شاعری سے ان کی مراد ایسی شاعری ہے جو فطرت کے اصولوں کے مطابق ہو یعنی وہ فنی ہیئتی اسلوبیاتی اور موضوعاتی سطوح پہ فطرت کے قریب ہو۔

سرسید تحریک بنیادی طور پر نثر کی تحریک ہے لیکن وہ شاعری کے خلاف نہیں تھے- ابتدا میں وہ خود بھی شاعری کرتے رہے لیکن ان کا میلان طبع شاعری کی طرف نہیں تھا- اس لیے بعد میں اسے ترک کر دیا- غزل سے انھیں ریزہ خیالی اور موضوعاتی یک رنگی کا شکوہ تھا- لکھتے ہیں:

> ہماری زبان کے علم و ادب میں بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی- شاعروں نے اپنی ہمت عاشقانہ غزلوں اور واسوختوں اور مدحیہ قصیدوں اور قصہ و کہانی کی مثنویوں میں صرف کی-(۵)''

اس لیے انھوں نے نظم کی حوصلہ افزائی کی- جب آزاد کی مثنوی ''خواب امن'' انھیں موصول ہوئی تو انھوں نے اس کی خوب تعریف کی- ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ اپنے کلام کو اور بھی زیادہ فطرت کے قریب کریں کیونکہ شاعری جتنی زیادہ فطرت کے قریب ہوگی اتنی ہی پرتاثیر بھی ہوگی- اسی طرح انھوں نے حالی کی مثنویوں ''حب وطن'' اور ''مناظرہ رحم و انصاف'' کو اپنے ادب کا کارنامہ قرار دیا- ان کی سادگی الفاظ' صفائی بیان اور عمدگی خیال کو خوب سراہا- انھوں نے حالی کو بھی یہی مشورہ دیا کہ نیچرل شاعری کی اس روش کو مزید آگے بڑھائیں کیونکہ اردو شاعری کی اس کی بے حد ضرورت ہے-

سرسید کی جدیدیت نے اس رمز کو پا لیا تھا کہ قافیہ و ردیف کی پابندی خیالات کو بھی پابند کر دیتی ہے- اسی لیے انھوں نے بے قافیہ نظم کی تخلیق پر زور دیا- لکھتے ہیں:

> ''ردیف و قافیہ کی پابندی گویا ذات شعر میں داخل تھی- رجز اور بے قافیہ شعر گوئی کا رواج نہیں تھا اور اب بھی شروع نہیں ہوا- ان باتوں کے نہ ہونے سے ہماری نظم صرف ناقص ہی نہ تھی بلکہ غیر مفید بھی تھی-(۶)''

سرسید احمد خان کا سب سے بڑا تنقیدی کارنامہ اردو نثر کی اصلاح و ترقی ہے- اگرچہ سرسید سے پہلے غالب اور فورٹ ولیم کالج نے اردو نثر کے حوالے سے اہم خدمات انجام دی تھیں- لیکن

جس طرح سرسید اور ان کے رفقا نے اردو نثر کے اسلوب میں سادگی اور سلاست پیدا کی' اس کے بعد اردو نثر اپنے بام عروج پر پہنچ گئی اور اس مقام پر آ گئی جہاں اس کے ذریعے دنیا کے تمام علوم و فنون اپنا اظہار پانے لگے- اس حوالے سے خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

''سید احمد نے اسلوب اور موضوعات کے اعتبار سے اردو ادب پر نمایاں اثرات ڈالے- دراصل انھوں نے اردو ادب کی تاریخ میں ایک نئی صبح کا آغاز کیا- انھوں نے اردو نثر کو مقفیٰ اور مسجع الفاظ سے پاک کیا اور سادہ الفاظ استعمال کرنے اور خیالات کو وضاحت سے بیان کرنے پر زور دیا اور اردو زبان کو علمی اور سنجیدہ خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اس طرح اردو ادب کے میدان کو وسیع کیا- انھوں نے اردو ادیبوں کو مشورہ دیا کہ وہ دوسری زبانوں کے ادب سے بھی استفادہ کریں-(۷)''

سرسید احمد خاں قدیم اسلوب کی خرابیوں سے پوری طرح آ گاہ تھے- اپنے ایک مضمون میں انھوں نے قدیم اسلوب کے لفظوں کو جمع کرنے' ہم وزن اور قریب التلفظ کلموں کو ملانے' دور از کار خیالات اور مبالغہ آمیز باتوں کو لکھنے تک محدود قرار دیا ہے- وہ کہتے ہیں کہ اس طرز تحریر میں تصنع کی وجہ سے نہ تو بات سمجھ آتی ہے اور نہ ہی اس کا اثر دلوں پر ہوتا ہے- ایک اور جگہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی- ہاتھ اٹھایا' جہاں تک ہو سکا عبارت پر توجہ دی- اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ مضمون کی ادا میں ہو- جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تا کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے-(۸)''

ادب کے بارے میں سرسید احمد خان افادی نقطۂ نظر کے قائل تھے- وہ ادب کو محض تفریح'

آرائش یا حصول مسرت کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے کسی نہ کسی مقصد کے تابع دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک سب سے بڑا مقصد معاشرے کی اصلاح اور تعلیم تھا۔ وہ ادب برائے ادب کے قائل نہیں تھے بلکہ ان کو ادب برائے زندگی پر ایمان تھا۔ ان کے نزدیک ادب محض ادیب کی تالیف قلب کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ قاری کی تربیت ذہنی کا بھی پابند تھا۔ اردو تنقید میں انھوں نے پہلی دفعہ قاری کی موجودگی کا احساس پیدا کیا اور ادیب کو شعوری طور پر پابند کیا کہ وہ معاشرے کے حوالے سے بھی ادب تخلیق کرے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ''سرسید نے ادیب اور اس کی تخلیق کو ہی اہمیت نہیں دی بلکہ قاری کی اساسی حیثیت کو بھی تسلیم کیا ہے اور یوں مصنف، تخلیق اور قاری کی ایک ہم رشتہ تثلیث قائم کر دی ہے۔ واضح رہے کہ سرسید نے مضمون کو طرز ادا پر فوقیت دی ہے لیکن انشاء کے بنیادی تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا اور طرز ادا میں مناسب لطف پیدا کرنے اور قاری کو سحر اسلوب میں لینے کی تلقین کی ہے۔(۹)''

اردو تنقید میں سرسید پہلے نقاد ہیں جنھوں نے انشاء پردازی پر مضمون کو فوقیت دی ہے۔ ان کے نزدیک بے معنی استعارات و تشبیہات اور فضول تک بندی سے ادب میں تخلیقی عناصر پیدا نہیں ہوتے بلکہ مصنف کا درد دل اور خلوص جذبات حسن و تاثیر کا باعث بنتے ہیں۔ خلوص جذبات اور دردمندی زندگی کی سچی اور فطری تصویر کاری سے پیدا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''سرسید نے ادب کے جمالیاتی تصور سے منہ موڑ کر اسے زندگی کے مقاصد سے وابستہ کیا۔ انھوں نے ادب کو افادی عمل کی حیثیت سے دیکھا اور اس کو تکمیل حیات اور ترقی کے لیے ایک اہم کارندہ اور وسیلہ قرار دیا۔ اس لیے سرسید اردو کے غالباً سب سے پہلے ترقی پسند ادیب اور نقاد تھے کہ وہ ادب کو محض تفریح اور بے غرض مسرت کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک

ادب محض جمالیاتی حظ کا سرچشمہ نہیں بلکہ اس سے قومی اور اجتماعی کام لیے جانے چاہئیں۔(۱۰)''

سرسید نے محض سادگی اور سلاست پر ہی ضرور نہیں دیا بلکہ ان کے نزدیک ہر صنف کی اپنی زبان ہوتی ہے اور اسے اس مخصوص زبان میں ہی لکھنا چاہیے۔ افسانوی نثر کو مضمون نگاری کے اسلوب میں اور تنقید کو شاعرانہ نثر میں نہیں لکھا جا سکتا۔ اسی طرح تاریخ نگاری، سوانح نگاری اور سیرت نگاری کے لیے علمی انداز نثر اختیار کرنا چاہیے نہ کہ افسانوی اسلوب۔ اس طرح تاریخ و سوانح و سیرت نہ افسانہ رہیں گے اور نہ ہی تاریخ و سوانح۔ سرسید کی تحریروں میں ہمیں یہ تفریق عملی طور پر بھی نظر آتی ہے۔ ان کے علمی مضامین کی زبان اور ہے اور تمثیلی مضامین کا اسلوب دیگر۔ اپنے اس تنقیدی نظریے کا اطلاق انھوں نے اپنی تاریخ نگاری پر بھی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آثار الصنادیہ کے پہلے ایڈیشن کی زبان اور ہے اور دوسرے ایڈیشن کی زبان اور۔ وہ تاریخ نگاری میں شبلی کی المامون کے انداز بیاں کے قائل تھے۔ المامون کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

''اردو زبان نے بہت کچھ ترقی کی ہے مگر اس بات کا بہت کم خیال رکھا ہے کہ ہر فن کے لیے زبان کا طرز بیان جداگانہ ہو۔ تاریخ کی کتابوں میں ناول (قصہ) اور ناول میں تاریخانہ طرز کو کیسی ہی فصاحت اور بلاغت سے برتا گیا ہو دونوں کو برباد کرتا ہے۔(۱۱)''

اردو ادب پر سرسید احمد خان کے اثرات بے حد نمایاں ہیں۔ ان کے رفقا نے ان کے خیالات سے خوب فیض حاصل کیا۔ آخر آخر آ کر ان کے بیشتر مخالفین بھی ان کی عظمت کے قائل ہو گئے۔ سرسید نے ادب کو عبارت آرائی اور خیال آرائی سے نکال کر ٹھوس مادی حقائق سے روشناس کرایا اور ادب کو صحیح معنوں میں تنقید حیات بنا دیا۔ ان کے تمام علمی و ادبی کام کی طرح ان کی تنقید پر بھی عقلیت پسندی، مادیت پسندی، حقیقت پسندی اور مقصدیت کی گہری چھاپ نظر آتی

ہے- ان کے ان نظریات کا پورے اردو ادب پر اثر پڑا اور یوں وہ ایک مختصر دور کے نتیجے میں انقلابی تبدیلیوں سے روشناس ہوا- انھوں نے اردو ادب کے جمود کو توڑ کر اس کو وسعت بخشی-

''سرسید نے اپنی تصانیف کے ذریعے اپنے زمانے کے مصنفوں اور ادیبوں کو بہت سے خیالات دیے- ان کے ان فکری اور تنقیدی خیالات سے ان کا دور خاصا متاثر ہوا- ان سے ان کے رفقائے خاص ہی اثر پذیر نہیں ہوئے بلکہ وہ لوگ بھی متاثر ہوئے جو ان کے دائرے سے باہر بلکہ ان کے مخالف تھے-(۱۲)''

سرسید احمد خان کی تنقیدی بصیرت پر لکھتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ اور ان کے زیر اثر دیگر کئی نقادوں نے لکھا کہ سرسید نے خود تو باقاعدہ تنقید نہیں لکھی لیکن ان کے تنقیدی نظریات' ان کے رفقا خصوصاً حالی نے مربوط کیے اور باقاعدہ تنقید کی بنیاد رکھی- اس قسم کی باتوں سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ حالی کی اپنی تنقیدی بصیرت تو نہیں تھی' البتہ انھوں نے سرسید کے نظریات کو مربوط کر دیا- اس نقطۂ نظر سے نہ تو سرسید کی عظمت میں اضافہ ہوا ہے اور نہ ہی حالی کی ادبی حیثیت پر کوئی فرق پڑا ہے- ادب کے بارے میں سرسید اور حالی کے بنیادی نظریات ایک تھے کیوں کہ ان کا مقصد حیات ایک تھا لیکن سرسید کو اپنے دیگر منصوبوں سے کبھی اتنی فرصت ہی نہیں ملی کہ وہ ان نظریات پر تنقید کی عمارت کھڑی کرتے- حالی کی تنقید پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اگر سرسید تنقید لکھتے تو یقیناً کچھ باتوں میں وہ حالی کے ہم خیال ہوتے- لیکن بہت سی باتوں میں ان کا انداز اختلافی ہوتا- خصوصاً شاعری کے تخلیقی عناصر کے حوالے سے جو مباحث مولانا حالی نے چھیڑے ہیں' وہ سرسید احمد خان کے دائرہ ضرورت سے باہر ہیں-

مقدمہ شعر و شاعری سے قبل اردو میں تنقید بالکل ابتدائی شکل میں موجود تھی اور زیادہ تر عملی تنقید کے نمونے ملتے تھے- سب سے پہلے شاعری کے حوالے سے اصول و نظریات مولانا الطاف حسین حالی نے وضع کیے- حالی ذہنی طور پر سرسید تحریک سے وابستہ تھے جس کی بنیادی خصوصیات

عقلیت پسندی، حقیقت پسندی، فطرت پسندی تھیں اور جس کا بنیادی مقصد معاشرتی اصلاح تھا- اس لیے حالی نے شاعری کا تعلق معاشرے سے قائم کیا-

مولانا حالی کا ادب کے بارے میں نظریہ خالص مادی نظریہ ہے- وہ ادب سے مادی تقاضے کرتے ہیں- اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ادب کے روحانی اور جمالیاتی وظیفوں سے ناواقف ہیں-شعر کی تفہیم اور وضاحت کے بارے میں انھوں نے مختلف مقامات پر جو کچھ لکھا ہے، اس بات کا ثبوت ہے کہ شاعری کی فہم کی تمام تخلیقی سطوح سے وہ آگاہ تھے لیکن ان کا عہد جن مسائل سے دو چار تھا، وہ اس بات کے متقاضی تھے کہ ادب اور شاعری بھی قومی ترقی میں اپنا کردار ادا کرے- مقدمہء شعر و شاعری اگرچہ اردو میں نظری تنقید کی پہلی اور نہایت اہم کتاب ہے لیکن حالی کا مقصد نقاد کے منصب پر فائز ہونا بھی نہیں تھا بلکہ وہ اپنے دور کی شاعری میں تبدیلیاں پیدا کرنا چاہتے تھے-

مولانا حالی افادی حوالے سے ہی سہی لیکن سوسائٹی کے لیے شاعری کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں- وہ افلاطون سے بالکل متفق نہیں کہ شاعروں کو ریاست سے باہر کر دینا چاہیے- حالی جو کام شاعری سے لینا چاہتے تھے وہ کام نثر سے بھی لیا جا سکتا تھا اور لیا گیا- حالی شاعری کو بعی ناگزیر سمجھتے تھے تو یقیناً اس کی جمالیاتی وجوہات بھی تھیں لیکن حالی نے ان جمالیاتی اقدار پر زور نہیں دیا کیونکہ وہ ان کے مقصد سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھیں- سرسید تحریک سے وابستگی سے قبل کی ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری تخلیقی اور جمالیاتی عناصر سے مالا مال تھی لیکن اپنی بعد کی شاعری میں انھوں نے مقصدیت کو مدنظر رکھا- یہ بھی نہیں کہ ان کے ادبی نقطۂ نظر کو بالکل ہی نہ سمجھا گیا ہو- بہت سے نقادوں نے ان کے تنقیدی نظریات کی تفہیم اسی حوالے سے کی ہے- ریاض احمد لکھتے ہیں:

''اس قسم کے تنقیدی اشارات سے یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ اگر ان لوگوں

کے سامنے عملی مقاصد نہ ہوتے' افراتفری کا زمانہ نہ ہوتا' ان کی تنقید ایک خاص ملی اور اخلاقی مقصد کے ماتحت ظہور پذیر نہ ہوتی تو وہ فن کا ایک نہایت سلجھا ہوا اور صحیح مفہوم پیش کرنے سے قاصر نہ رہتے۔(۱۳)''

مولانا حالی کے زمانے میں یہ تصور عام تھا کہ شاعری دور زوال میں ترقی کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اردو شاعری کے عروج کا زمانہ برصغیر میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کا زمانہ تھا اس لیے سیاسی زوال کو تہذیبی زوال بھی سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ یہ کوئی ضروری نہیں ہوتا کہ سیاسی زوال کے ساتھ ہی تہذیبی زوال بھی شروع ہو جائے۔ تہذیب سیاست سے بڑی حقیقت ہوتی ہے اس لیے ہر بڑی حقیقت کی طرح اس کا زوال بھی دیر سے شروع ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ میر و سودا کے عہد میں ہند اسلامی تہذیب اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ اس کا زوال کہیں بعد میں شروع ہوا۔ شاعری کا تعلق سیاست سے زیادہ تہذیب و معاشرت سے ہوتا ہے۔ جب تہذیب و معاشرت اعلیٰ مقام پر ہوتے ہیں تو شاعری بھی اعلیٰ درجے کی تخلیق ہوتی ہے۔

مولانا حالی شعر و ادب میں جمود کے قائل نہیں تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاعری ایک ضروری انسانی ضرورت ہے جس کی وجہ سے یہ کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ دوسرے یہ کہ شاعری جوں جوں آگے بڑھتی ہے' نئے نئے استعارات اور تشبیہات وضع ہوتی ہیں۔ نئے نئے خیالات شاعری میں جگہ بناتے ہیں۔ وہ ان نقادوں میں سے نہیں ہیں جو ادب میں آنے والے برے ادوار سے مایوس ہو کر ادب کی موت کا اعلان کر دیں بلکہ وہ اسی جمود میں سے تحرک پیدا کرنے کے لیے نظریات وضع کرتے ہیں اور ان نظریات پر خود بھی عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی مائل کرتے ہیں۔ آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''حالی شاعری اور آرٹ کو قوموں کی زندگی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ اس کے قائل نہیں کہ تہذیب کی ترقی سے شاعری میں زوال آ جاتا ہے۔ فنون

لطیفہ تاثرات اور حسیات کی سوئی بستی کو جگاتے ہیں- ان تاثرات کی بیداری سے زندگی میں وسعت اور فراخی آتی ہے- قومیں آرٹ ادب اور شاعری سے بے نیاز رہ کر اپنے لطیف حسیات کھونے لگیں گے- ادب چونکہ ایک زمانے میں سستے جذبات کی عکاسی پر قانع رہا- محض نقش نگینے بنانے اور جادو جگانے کے کام میں آتا رہا- تلخیوں کو بھلاتا اور رنگین پناہ گاہیں تیار کرتا رہا- اس لیے لوگ شعر کی ترقی کو زوال آمادہ تمدن کی پہچان سمجھنے لگے- حالی کے وقت سے تنقید شعرو ادب میں رہنمائی اور اصلاح کا کام شروع کرتی ہے- تنقید کو اس کا حقیقی منصب ملتا ہے اور وہ تجربات کی قدر و قیمت سے بحث کرنے لگتی ہے- جو لوگ محض زبان کے معیار سے یا محض دبستانوں کی رعایت سے یا شرفا کے نقطۂ نظر سے شاعروں کو پرکھتے تھے وہ تنقید کے حقیقی مفہوم سے ناواقف تھے-(۱۴)''

تہذیب کے شاعری پر اثرات کے ساتھ مولانا حالی شاعری کے انسانی طبائع پر اثرات کا جائزہ لیتے ہیں- اگر چہ اس موضوع پر بھی ان کے ذہن اور خیالات میں صفائی موجود ہیں اور وہ شعر کے انسان کے پاکیزہ جذبات پر اثر کے طریقہ کار سے بھی واقف نظر آتے ہیں لیکن مثال دیتے ہیں تو ایک محدود اخلاقیات کا تصور ابھرتا ہے- ایسے موقوع پر بہت سے جدید نقاد فوراً اپنے ہتھیار لے کر ان پر پل پڑتے ہیں- مولانا حالی کہتے ہیں کہ شعر براہ راست علم اخلاق کی تلقین نہیں کرتا کیونکہ اگر ایسا کیا جائے تو اس کی تاثیر بھی محدود ہوگی- شاعری براہ راست اخلاقیات کی تلقین کرنے کی بجائے انسان کو اندر سے مصفا اور منزا کرتی ہے جس کی وجہ سے اس کے اندر دل گدازی پیدا ہوتی ہے- یہی دل گدازی اس کے اندر اعلیٰ انسانی خصائص پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے- یہ اعلیٰ انسانی خصائص کون کون سے ہیں- اس کا تعین کرنا ممکن نہیں کیونکہ یہ ہر قوم میں مختلف ہوتے

ہیں- ان کا تعلق انسان کے نظریہ حیات سے ہے- سو جس قوم کا نظریہء حیات جیسا ہوگا اس کا اخلاقی نظام بھی ویسا ہی ہوگا- اس لیے شاعری سے انسان جس اعلیٰ انسانی کیفیت میں چلا جاتا ہے وہاں اس میں اعلیٰ انسانی اقدار اس کے قومی مزاج کے مطابق پیدا ہوں گی- حالی کہتے ہیں کہ روز مرہ کی دنیاوی زندگی انسان کو روحانی اور باطنی طور پر مردہ کر دیتی ہے- شاعری ایسے عالم میں انسان کو اس فضا سے نکالتی ہے اور اس کے اندر انسانی جذبات و احساسات پیدا کرتی ہے- یہی انسانی جذبات و احساسات ہی اس کے اندر اعلیٰ اخلاقی خصائص پیدا کرتے ہیں- لکھتے ہیں:

> ''پس ہر قوم اپنے ذہن کی جودت اور ادراک کی بلندی کے موافق شعر سے اخلاق فاضلہ اکتساب کر سکتی ہے- قومی افتخار' قومی عزت' عہد و پیمان کی پابندی' بے دھڑک اپنے تمام عزم پورے کرنے' استقلال کے ساتھ سختیوں کو برداشت کرنا اور ایسے فائدوں پر نگاہ نہ کرنی جو پاک ذریعوں سے حاصل نہ ہو سکیں اور اس قسم کی وہ تمام خصلتیں جن کے ہونے سے ساری قوم تمام عالم کی نگاہ میں چمک اٹھتی ہے اور جن کے نہ ہونے سے بڑی سے بڑی قومی سلطنت دنیا کی نظروں میں ذلیل رہتی ہے- اگر کسی قوم میں بالکل شعر ہی کی بدولت پیدا نہیں ہو جاتیں تو بلاشبہ ان کی بنیاد تو اس میں شعر ہی کی بدولت پڑتی ہے-(۱۵)''

کلیم الدین احمد حالی کے اس اخلاقی نقطۂ نظر سے متفق نہیں ہیں- وہ کہتے ہیں کہ مختلف قومیں مختلف زمانوں میں مختلف اخلاقی اقدار کی حامل ہوتی ہیں- اس لیے اخلاقیات کو محض قومی عزت' قومی افتخار' پاک ذریعوں سے حاصل ہونے والے فائدوں تک محدود کرنا سطحیت اور شعر نافہمی ہے- شعر کا وظیفہ یہ کبھی بھی نہیں رہا- حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ اس قسم کی باتیں جب لکھ رہے تھے تو ان کی نظر حالی کے ان فقروں پر بالکل نہیں گئی اور انھوں نے ان کی معنویت پر غور کرنے کی زحمت

بالکل نہیں کی۔

''۱۔ شعر اگر چہ براہ راست علم اخلاق کی طرح تلقین اور تربیت نہیں کرتا۔

۲۔ ہر قوم اپنے ذہن کی جودت اور ادراک کی بلندی کے موافق شعر سے اخلاق فاضلہ اکتساب کر سکتی ہے۔(۱۶)،

یہ بات درست ہے کہ مولانا حالی معلم اخلاق ہیں اور یہ بات بھی درست ہے کہ وہ جس اخلاقیات کی بات کرتے ہیں وہ بھی محدود ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اخلاقیات کے بارے میں جانتے بھی نہیں ہیں۔ وہ اخلاقیات کی وسعت سے واقف ہیں لیکن ان کا زمانہ اخلاقیات کے جن حصوں کا متقاضی تھا۔

اخلاقیات کی بحث کے بعد مولانا حالی شاعری پر سوسائٹی اور سوسائٹی پر شاعری کے اثرات کا جائزہ لیتے ہیں۔ حالی شاعر کو بھی معاشرے کا فرد سمجھتے ہیں۔ جس طرح معاشرے میں پھیلے ہوئے نظریات' خیالات' رجحانات ہر فرد کی زندگی اور سوچ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی طرح شاعر بھی ان سے اثرات قبول کرتے ہیں۔ گویا افراد کی ذہن سازی جس طرح معاشرتی حالات کرتے ہیں' شاعر کی ذہن سازی میں بھی یہ حالات اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ اس طرح جب وہ شعر کہتا ہے تو اسی ذہن کی عکاسی کرتا ہے جو معاشرہ بناتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''قاعدہ ہے کہ جس قدر سوسائٹی کے خیالات' اس کی رائیں' اس کی عادتیں' اس کی رغبتیں' اس کا میلان اور مذاق بدلتا ہے اسی قدر شعر کی حالت بدلتی رہتی ہے اور یہ تبدیلی بالکل بے معلوم ہوتی ہے کیونکہ سوسائٹی کی حالت کو دیکھ کر شاعر قصداً اپنا رنگ نہیں بدلتا بلکہ سوسائٹی کے ساتھ ساتھ وہ خود بخود بدلتا چلا جاتا ہے۔(۱۷)''

حالی اردو کے پہلے نقاد ہیں جنھوں نے شعوری طور پر ادب اور سماج کا تعلق قائم کیا۔ انھوں

نے شاعری پر معاشرے اور معاشرے پر شاعری کے اثرات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور مثالیں پیش کی ہیں کہ یہ عمل کس طرح وقوع پذیر ہوتا ہے- ان کے یہ خیالات ان کے سماجی شعور کی نشاندہی کرتے ہیں- اگر چہ مقدمہ شعرو شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ وہ جدید عمرانی افکار سے آگاہ نہیں تھے-لیکن اس کے باوجود انھوں نے ادب اور سماج کا رشتہ قائم کرنے میں جس شعور کا ثبوت دیا ہے وہ ان کی نظریاتی پختگی کی دلیل ہے- دیکھا جائے تو یہ اس وقت کے ادب اور معاشرے کی سب سے بڑی ضرورت تھی جسے مولانا حالی نے نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کیا- ان کے خیالات میں کسی قسم کی پیچیدگی یا گنجلک پن موجود نہیں ہے- وہ جو بات بھی کرتے ہیں دلائل اور شواہد کے ساتھ کرتے ہیں-

اس بحث کے ضمن میں مولانا نے ایک اور بحث بھی چھیڑی ہے اور وہ یہ ہے کہ شخصی حکومتیں شاعری پر کیسے اثر انداز ہوتی ہیں اور قومی حکومتوں میں کس قسم کی شاعری وجود میں آتی ہے- وہ کہتے ہیں کہ شخصی حکومتوں میں شاعری خصوصاً قصیدہ گوئی دربار تک رسائی اور بادشاہ وقت کے تقرب کا ذریعہ بنتی ہے- پرانے وقتوں میں بادشاہ اور ان کی پیروی میں امراو وزراء اپنے ساتھ شاعروں کو منسلک رکھتے تھے- دیگر علوم وفنون کے ماہرین کی طرح شاعر بھی کسی دربار کی عظمت کی نشانی سمجھے جاتے تھے-کسی دربار سے زیادہ شاعروں کا منسلک ہونا باعث فخر تھا- اسی لیے بادشاہ جی کھول کر شاعروں کو نوازتے اور جواب میں توقع رکھتے کہ ان کے کمالات' ان کی شجاعت' سخاوت وانصاف وغیرہ کی مبالغہ آمیز تعریف کی جائے اور شاعر جس کے معاشی مفادات دربار سے وابستہ ہوتے تھے اس کام کے کرنے پر مجبور تھے-

حالی کا یہ نظریہ ایک بے حد ترقی پسند نظریہ تھا- بعد میں ترقی پسندوں نے اس سے بہت کام لیا- اگر چہ ان کا مآخذ حالی کے بجائے مارکس اور لینن کی فکر تھی- ان کا خیال بھی یہ تھا کہ مطلق العنان بادشاہ شاعر اور شاعری دونوں کا استحصال کرتے ہیں- ایسے ادوار میں شاعری کو آزادانہ

پنپنے کا موقع کم ملتا ہے جس کی وجہ سے جاگیرداری نظام میں اعلیٰ شاعری کے امکانات کم ہو جاتے ہیں- یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اسی جاگیرداری نظام میں دنیا بھر میں اعلیٰ ادب بھی تخلیق ہوا- یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ان شاعروں پر شخصی حکومتوں کا دباؤ نہ ہوتا تو عین ممکن ہے کہ قصدہ و ہجو کے بجائے وہ اور بھی عظیم شاعری تخلیق کر جاتے- پھر اردو کے حوالے سے دیکھا جائے تو میرؔ غالبؔ انیس اور اقبال درباروں سے اس طرح منسلک نہیں تھے جس طرح مثلاً سودا یا ذوق تھے- بہرحال یہ ماننا پڑتا ہے کہ حالی کا یہ نقطۂ نظر کہ شاعری کو شخصی حکومتوں میں پنپنے کا موقع نہیں ملتا' درست ہے- لکھتے ہیں:

> ''خود مختار بادشاہ جن کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہیں ہوتا اور تمام بیت المال جن کا جیب خرچ ہوتا ہے' ان کی بے دریغ بخشش شعرا کی آزادی کے حق میں سم قاتل ہوتی ہے- وہ شاعر جس کو قوم کا سرتاج اور سرمایہء افتخار ہونا چاہیے ایک بندۂ ہوا و ہوس کے دروازے پر دریوزہ گروں کی طرح صدا لگاتا اور شیئاً للہ کہتا ہوا پہنچتا ہے-(۱۸)''

مولانا حالی نے ایسی شاعری کے جو سوسائٹی کے لیے فائدہ مند ہو اصول وضوابط بھی طے کیے ہیں- وہ کہتے ہیں کہ شاعری کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ اچھی شاعری کے قاعدے مقرر کیے جائیں اور معاشرے میں ان کی ترویج و اشاعت کو یقینی بنایا جائے- حالی مدلل انداز میں مختلف اقوال اور اشعار کی مثالوں سے ثابت کرتے ہیں کہ شاعری کے لیے وزن اور قافیہ غیر ضروری ہیں بلکہ بعض اوقات یہ دونوں تخیل کو محدود کر دیتے ہیں- ان کے علاوہ وہ صنائع بدائع کو بھی شاعری کے لیے نقصان دہ قرار دیتے ہیں- ان پابندیوں سے شعر میں حسن اور تاثیر پیدا ہونے کے بجائے شاعری کا رستہ بند ہوتا ہے- شاعر فطری شاعری کرنے کے بجائے انہی کا التزام کرنے کی طرف متوجہ رہتا ہے جس کی وجہ اس کے تخیل کو اپنا کام کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے- البتہ وہ ان پر

پابندی بھی نہیں لگاتے- اگر تخیل کی کارفرمائی میں شعر میں کوئی صنعت خود بخود آ جاتی ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ ایسے فطری انداز میں آئی ہوئی صنعت زیادہ حسن اور تاثیر کا باعث ہوتی ہے- شاعری کے لیے وہ تین شرطوں یعنی تخیل' مطالعہ کائنات اور تفحص الفاظ کو ضروری قرار دیتے ہیں- ان کے نزدیک تخیل ایسی قوت ہے جو شاعر کو زمان و مکان سے ماورا کر دیتی ہے اور وہ جو کہتا ہے ایسے سلیقہ سے کہتا ہے کہ وہ فطری معلوم ہوتا ہے-

اس کے بعد حالی شعر کے لازمی خصائص بیان کرنے میں جن سے کوئی شعر اعلیٰ یا ادنیٰ قرار پاتا ہے- وہ ملٹن کے حوالے سے کہتے ہیں کہ شعر کی خوبی یہ ہے کہ سادہ ہو' جوش سے بھرا ہوا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو- سید محمد نواب کریم لکھتے ہیں:

> ''اس سلسلے میں کلیم الدین اور ڈاکٹر احسن دونوں نے لفظ اصلیت پر اعتراض کیا ہے- دونوں کہتے ہیں کہ ملٹن نے جو الفاظ استعمال کیے تھے وہ تھے Passionate sensuous, simple جن کا ترجمہ علی الترتیب سادہ' احتساسی اور پرجوش ہونا چاہیے- اول اور آخر کے ترجمہ میں تو حالی نے غلطی نہیں کی لیکن Sensuous کا ترجمہ اصلیت غلط ہے-(۱۹)''

اس سلسلے میں ہمیں نواب صاحب سے یہ عرض کرنا ہے کہ Sensuousness حالی کا مسئلہ نہیں تھا اور نہ ملٹن کے خیالات کو بیان کرنا ان کا مقصد تھا- حالی کا مقصد تو اردو شاعری کے لیے اصول مرتب کرنا تھا تا کہ ایک ایسی شاعری وجود میں آ سکے جو نہ صرف یہ کہ سوسائٹی کے لیے مفید ہو بلکہ مسلمان قوم کا مورال بلند کر کے اسے اعلیٰ تہذیبی' سیاسی زندگی کی طرف جانے والے راستے پر گامزن ہونے کے لیے متحرک کرے- ظاہر ہے ایسی شاعری جس کی خوبی Sensuousness ہو اس مقصد کے لیے مددگار ثابت نہیں ہو سکتی تھی اس لیے حالی نے Sensuousness کے متبادل کے طور پر اصلیت کا لفظ استعمال کیا ہے- اس حوالے سے ڈاکٹر عبارت بریلوی لکھتے ہیں:

''حالی نے جو نقطۂ نظر اختیار کیا اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ملٹن کے نظریات اگر ان تک نہ بھی پہنچتے تب بھی وہ انھیں خصوصیات کو شاعری کے لیے ضروری قرار دیتے- کیونکہ ان کی ذہنی نشوونما جس ماحول میں ہوئی' ماحول کے جو اثرات ان پر پڑے اور ان کے شعور کی بیداری نے حالات کا جو اثر قبول کیا ان کی وجہ سے ان کے لیے لازمی تھا کہ وہ انھیں خصوصیات کو شاعری کے لیے ضروری قرار دیتے-(۲۰)

مقدمہ شعروشاعری کا دوسرا حصہ چند اصناف شعر کے تجزیہ اور اصلاح سے مخصوص ہے- اس حوالے سے انھوں نے سب سے پہلے غزل کو منتخب کیا ہے کیونکہ یہ صنف مرغوب خاص و عام ہے- غزل کے حوالے سے بھی انھوں نے وہی خامیاں بیان کی ہیں جو انھوں نے نظری مباحث میں شاعری کی گنوائی ہیں- وہ کہتے ہیں کہ غزل چند موضوعات تک محدود ہو کر رہ گئی ہے جس کی وجہ سے اس میں تاثیر باقی نہیں رہی- پھر یہ موضوعات بھی سینکڑوں سالوں سے اردو فارسی شاعری میں بیان کیے جاتے رہے ہیں اور اب ان میں تازگی اور ندرت باقی نہیں رہی- غزل محض خیالی موضوعات کا مرکب بن کر رہ گئی ہے- اس میں سادگی اصلیت اور جوش نہ ہونے کے برابر ہیں- حالی نے اس پر بہت تفصیلی بحث کی ہے اور بے شمار مثالیں اپنے موقف کی تائید میں دی ہیں- تفصیل سے بچتے ہوئے اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ وہ غزل میں بھی وہی خوبیاں دیکھنا چاہتے ہیں جو شاعری کے لیے انھوں نے بیان کی ہیں- یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ انھوں نے جہاں غزل کی تعریف کی ہے اعلیٰ شاعروں کی مثالیں دی ہیں اور جہاں وہ اس سے نالاں ہیں وہ دوسرے اور تیسرے درجے کے شعرا کی شاعری ہے جو غزل کے موضوعات کو تقلیداً موزوں کرنے کا کام کرتے رہے ہیں-

حالی کے غزل کی صنف پر اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''وہ اس سے بے زار ہیں لیکن اسے خارج کر دینے کے حق میں نہیں- وہ اس
میں وسعت اور اصلاح چاہتے ہیں اور اس اصلاح کا خاکہ بھی پیش کیا ہے-
چنانچہ موجودہ غزل اسی سانچہ میں ڈھل گئی ہے- یہ حالی کا فیض ہے-(۲۱)''

غزل کے بعد انھوں نے قصیدہ اور مرثیہ پر اظہار خیال کیا ہے- وہ ان دونوں اصناف کو ادب کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں- لیکن اردو زبان میں ان کے حوالے سے جو سرمایہ موجود ہے- وہ اس کے بالکل قائل نہیں ہیں- خاص طور پر اردو قصیدہ نگاری کو تو وہ لغو اور بے ہودہ خیال کرتے ہیں- قصیدہ ایسی صنف ہے جس میں قابل تعریف لوگوں کی تعریف کرنی چاہیے تا کہ وہ اپنی خوبیوں کو نہ صرف برقرار رکھیں بلکہ ان کو بڑھانے کی کوشش بھی کریں اور قابل مذمت لوگوں کی خرابیوں کو بیان کرنا چاہیے تا کہ وہ اپنی خرابیوں کے سلسلے میں محتاط ہو جائیں بلکہ دوسروں کو بھی کان ہو جائیں کہ ایسی خصوصیات شرمندگی کا باعث ہوتی ہیں- وہ کہتے ہیں کہ قصیدہ اردو شاعری میں اپنے اس وسیع مفہوم میں رائج نہیں رہا اور زیادہ تر بادشاہوں اور صاحبان اقتدار و اختیار کی جھوٹی مدح سرائی کے کام آتا رہا ہے یا دشمنوں کی غلط ہجو گوئی میں استعمال ہوا ہے جس کی وجہ سے اس صنف کی توقیر اردو شاعری سے نہیں ہو سکی- وہ مرثیہ کے قائل ہیں اور اردو مرثیہ خصوصاً میر انیس کی شاعری کے مداح ہیں لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ اس صنف کو بھی محض واقعہء کربلا سے مخصوص نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس صنف کے تقاضوں کے مطابق اسے وسعت دینی چاہیے ورنہ واقعہ کربلا سے متعلق مرثیہ کو میر انیس نے اس بلندی تک پہنچا دیا ہے کہ اب مزید نئے شاعروں کی اس صنف میں طبع آزمائی کا کوئی فائدہ نہ شاعری کو ہے اور نہ ہی ان شاعروں کو ہوگا- مرثیہ کے حوالے سے حالی کے خیالات کی تائید سید محمد نواب کریم ان الفاظ میں کرتے ہیں-

''حالی نے مرثیہ نگاری کے حوالے سے جو رائیں دی ہیں وہ نہایت مناسب
ہیں- اگر مرثیہ کو بحیثیت صنف ترقی کرنا ہے تو اس کے دائرے کو وسیع کرنا

ہوگا-(۲۲)''

آخر میں حالی نے مثنوی کی صنف کا جائزہ لیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ صنف موجودہ دور کی عکاسی کے لیے بہترین ہے- کیونکہ ایک تو اس میں غزل قصیدہ یا مرثیہ کی طرح قافیہ کی پابندی نہیں ہے- بلکہ ہر بیت میں قافیہ بدل جاتا ہے جو مضمون کو آزادی سے بیان کرنے میں معاونت کرتا ہے- دوسرے یہ کہ اس میں ربط و تسلسل پایا جاتا ہے جو موجودہ حالات میں بے حد ضروری ہے- آج کے دور میں غزل کی ایمائیت اور اختصار کی نسبت نظم کی تفصیل اور ارتباط ضروری ہے- پھر وہ اردو فارسی مثنویوں کا جائزہ لے کر ان کی خوبیوں خامیوں پر روشنی ڈالتے ہیں- مثنوی کی اصلاح کے لیے بھی ان کے وہی پیمانے ہیں جو انھوں نے اپنی نظری تنقید میں بیان کیے ہیں اور غزل قصیدہ اور مرثیہ پر لاگو کیے ہیں- ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''حالی نے غزل کی طرح مثنوی اور قصیدہ کی اہمیت سے بھی بحث کی ہے خصوصاً اردو مثنوی پر بڑا عمدہ تبصرہ کیا ہے- اس صنف کے لوازم اور اہم مثنویوں کی قدر و قیمت خوب اچھی طرح بیان کی ہے-(۲۳)''

حالی کے سر اردو تنقید نگاری میں اولیت کا سہرا ہی نہیں بندھتا بلکہ ان کی تنقید کی اہمیت آج بھی تسلیم کی جاتی ہے- عموماً یہ ہوتا ہے کہ اولیت کا شرف کسی کے حصے میں آتا لیکن اس صنف میں اعلیٰ تخلیق بعد میں آنے والوں کے حصے میں آتی ہے- اردو تنقید میں بعض ایسے مباحث ہیں جو حالی نے آغاز کیے لیکن وہ آج بھی اپنی اہمیت کے اعتبار سے اتنے ہی زندہ ہیں جتنے کہ حالی کے دور میں-

''تقریضوں میں حالی صرف تعریف ہی نہیں کرتے بلکہ جو بات کھٹکتی ہے اس کو اشاروں اور کنایوں میں کسی نہ کسی پہلو سے ظاہر کر دیتے ہیں- اس طرح ان کی تقریظ روایتی انداز تقریظ سے مختلف ہو جاتی ہے- جہاں تک ان کے

تبصروں کا تعلق ہے- وہ موجودہ اصول تبصرہ نگاری سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں-(۲۴)''

مولانا حالی کی تنقید کے خلاف مختلف حوالوں سے بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اختلاف رکھنے والے بھی ان کے کام کی سنجیدگی اور اہمیت کے قائل ہیں- حق میں لکھنے والوں نے بھی کئی حوالوں سے ان کے نظریات پر گرفت کی ہے- سب سے زیادہ اس پر اعتراض ہوا کہ مولانا نے مغربی ادب کے جو حوالے مقدمہ میں نقل کیے ہیں یا تو غلط ہیں یا سند کا درجہ نہیں رکھتے لیکن ایک بات کا سبھی نقادوں نے اعتراف کیا ہے کہ مولانا حالی ہی وہ پہلے نقاد ہیں جنھوں نے ادب اور زندگی اور ادب اور سماج کا رشتہ قائم کیا ہے- ان کی تنقید کی بنیاد سماجیات پر قائم ہے- یہ ان کے عہد کی ضرورت بھی تھی اور اردو تنقید کی بھی ضرورت تھی- سرسید تحریک عموماً اور مولانا حالی کی تنقید خصوصاً اس حوالے سے قابل تعریف ہیں کہ انھوں نے نئی زندگی اور نئے ادب کے دروازے کو برصغیر کے عوام کے لیے وا کیا-

مولانا شبلی نعمانی کا شمار بھی اپنے عہد کے اہم نقادوں میں ہوتا ہے- اردو تنقید کے پہلے تین نقاد حالی، شبلی اور آزاد ہیں جنھوں نے تنقید کو چند اصطلاحوں سے نکال کر باقاعدہ نظریہ سازی کی- شبلی بنیادی طور پر مشرقی مزاج کے حامل تھے اس لیے ان کی تنقید میں بھی مشرقیت نمایاں ہے- وہ شاعری کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں پر زیادہ زور دیتے ہیں- شبلی کو اکثر نقادوں نے جمالیاتی اور تاثراتی دبستان تنقید سے منسلک کیا ہے- کیونکہ وہ شعر کو افادی قدروں سے زیادہ حصول مسرت کا ذریعہ سمجھتے ہیں- نورالحسن نقوی لکھتے ہیں:

''حالی کے بعد شبلی ہمارے دوسرے بڑے نقاد ہیں جن کے تنقیدی خیالات نے اپنے زمانے کے ادبی ذوق کو بے حد متاثر کیا اور ان کے نظریات کی صدائے بازگشت کسی نہ کسی شکل میں آج بھی سنائی دیتی ہے- ان کی تصانیف

کا مطالعہ کیجیے تو قدم قدم پر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے بیشتر خیالات حالی کے خیالات کی ضد ہیں- حالی شعر و ادب سے افادیت کا مطالبہ کرتے ہیں یعنی ان کے نزدیک شاعری کا اصل کام اخلاق کو درست کرنا اور زندگی کو سنوارنا ہے- شبلی کے نزدیک شاعری کا مقصد ہے پڑھنے یا سننے والے کو مسرت عطا کرنا- ان کی نظر اس حقیقت پر رہتی ہے کہ فن کار نے فن کے تقاضوں کو کس حد تک پورا کیا- اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ شبلی جمالیاتی نقاد ہیں- ان کے نزدیک شعر و ادب میں حسن کاری ہی اصل شے ہے(۲۵)-''

شبلی کی تنقید جمالیاتی اصولوں سے ترتیب پاتی ہے- لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ان کے ہاں سماجی حوالے موجود ہی نہ ہوں- شبلی جیسی وسیع الجہت شخصیت سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ صرف ایک ہی حوالے سے تنقید لکھتے ہوں- البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حالی کے ہاں اصلاحی عنصر نمایاں ہے اور شبلی کے ہاں جمالیاتی- ویسے بھی سرسید کی اصلاحی تحریک سے وابستہ ادیب کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ مقصدیت اور اصلاحی نقطۂ نظر سے بالکل بے گانہ ہو- پھر شبلی کا تاریخی شعور بھی اس امر کا متقاضی ہے کہ وہ ادب پر ہونے والے معاشرتی و عمرانی اثرات کو نظر انداز نہ کریں- یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کی تنقید میں مضبوط عمرانی حوالے مل جاتے ہیں- ڈاکٹر شارب ردولوی لکھتے ہیں:

''یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی تنقید صرف تاثراتی ہی ہے کیونکہ وہ ایک گہرا تاریخی و معاشرتی شعور بھی رکھتے تھے- ان کی شخصیت کے کئی پہلو نظر آتے ہیں- وہ ادب میں ایک طرف سیاسی ردوبدل کے اثرات دیکھتے ہیں تو دوسری طرف ذوقی اور جمالیاتی پہلوؤں کا خیال رکھتے ہیں-(۲۶)''

شبلی کی تنقید میں شعر العجم جلد چہارم کو وہی مقام حاصل ہے جو حالی کی تنقید میں مقدمہ شعر و شاعری کو- شعر کی ماہیت، تخیل، الفاظ اور ان کے استعمال، سادگی، اصلیت، شعر کی تاثیر، نظام حکومت

کا شاعری پر، شخصی حکومت کا شاعری پر، معاشرت کا شاعری پر اثر وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جن کے بارے میں دونوں نقادوں نے اپنی کتابوں میں اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اظہار خیال کیا ہے۔ کہیں ان کی آرا میں اتفاق اور کہیں اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔ ایک نے کسی موضوع کو ضروری خیال کرتے ہوئے اس پر زیادہ تفصیل سے لکھا ہے تو کسی نے اور موضوع پر۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ دونوں کے ایک دوسرے کے تنقیدی نظریات پر کچھ نہ کچھ اثرات اور دونوں پر سرسید کے نظریۂ ادب کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

شعر العجم جلد چہارم تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں شعر کی ماہیت پر بحث ہے۔ دوسرے حصے میں فارسی شاعری کے پس منظر میں شعر اور معاشرت کے مختلف اجزا کے اثرات پر بحث ہے اور تیسرے حصے میں فارسی شاعری پر تبصرہ ہے۔ اس کتاب کا دوسرا باب عمرانی تنقید کے حوالے سے ہمارے لیے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ پہلے اور تیسرے باب میں جزوی طور پر عمرانی حوالے موجود ہیں ورنہ ان ابواب پر جمالیاتی نقطۂ نظر کا غلبہ ہے اور جس کی وجہ سے شبلی کو جمالیاتی تنقید کے دبستان سے منسلک کیا جاتا ہے۔ شبلی شاعری کو ذوقی اور وجدانی چیز قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک شعر کا نمایاں ترین وصف جذبات انسانی کو برانگیختہ کرنا ہے۔ حالی شعر کے اس وصف کو قوم کی اصلاح کے لیے استعمال کرنے کے حق میں ہیں جبکہ شبلی اسے داخلی کیفیت قرار دیتے ہیں۔ حالی کے نزدیک شاعری لوگوں کی اصلاح کا ذریعہ ہے یعنی وہ قاری کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں جبکہ شبلی کہتے ہیں کہ ''اصلی شاعری وہ ہے جس کو سامعین سے کوئی غرض نہ ہو۔ حالی شاعری کے لیے متخیلہ کو لازمی سمجھتے ہیں اور شبلی بھی۔ لیکن شبلی محاکات کو بھی شعر کی لازمی شرط قرار دیتے ہیں۔ حالی صنائع بدائع کو شاعری کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں جبکہ شبلی ضروری سمجھتے ہیں۔

شعر العجم جلد چہارم میں پہلی بحث جس میں عمرانی حوالہ ملتا ہے۔ سادگی ادا کی بحث ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سادگی ادا سے مراد یہ ہے کہ جو مضمون شعر میں ادا کیا جائے۔ بے تکلف سمجھ میں آ

جائے- اس کے لیے وہ چند ضروری باتوں کی پابندی عاید کرتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں-

''۱- جملوں کے اجزا کی وہ ترتیب رکھی جائے جو عموماً اصلی حالت میں ہوتی ہے-

۲- مضمون کے جس قدر اجزا ہیں ان کا کوئی جزو رہ نہ جائے-

۳- استعارے اور تشبیہیں دور از فہم نہ ہوں-

۴- تلمیحات ایسی نہیں ہونی چاہیں جو کسی کو معلوم نہ ہوں-

۵- سادگی ادا میں اس بات کو بہت دخل ہے کہ روزمرہ اور بول چال کا زیادہ خیال رکھا جائے- روزمرہ چونکہ عام زبانوں پر چڑھا ہوا ہوتا ہے- اس لیے ایک لفظ ادا ہونے کے ساتھ فوراً پورا جملہ ذہن میں آ جاتا ہے اور اس کے سہارے سے مشکل سے مشکل مضمون کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے-(۲۷)،

اس اقتباس سے ایک بات تو یہ ثابت ہوتی ہے کہ وہ قاری کی اہمیت کے قائل ہیں دوسرے یہ کہ وہ شعری زبان کو نثر کی ترکیب اور روزمرہ بول چال کی زبان کے قریب لانا چاہتے ہیں- روزمرہ بول چال کی زبان معاشرتی میلانات و رجحانات ونفسیات کی عکاسی کرتی ہے- یہی بات تیرہویں، چودھویں صدی عیسوی میں دانتے نے اپنے مضمون ''عام بول چال کی زبان کا ادبی استعمال'' میں کہی تھی- اگرچہ شبلی پر دانتے کے اثرات نہیں ہیں- کیونکہ وہ اپنے دور کے ادب کے مسائل کے حوالے سے اسے ضروری سمجھتے ہیں لیکن دانتے اور شبلی دونوں اپنی اپنی زبان کے ادب کے ابتدائی زمانے کے نقاد ہیں اور دونوں کو ادب میں ایسے ہی مسائل درپیش تھے- دونوں نے زبان کے معاملے میں اپنے اپنے ادوار کی عمرانی ضرورتوں کو محسوس کر لیا تھا-

اس کے بعد شبلی نے واقعیت یا اصلیت کی بحث چھیڑی ہے اور اسے شعر میں تاثیر پیدا کرنے کا ایک اہم ذریعہ قرار دیا ہے- مولانا حالی کا بھی یہی نقطۂ نظر تھا- وہ شعر میں واقعیت یا مبالغہ کے عناصر کو تمدنی اثرات کا ثمرہ قرار دیتے ہیں- لکھتے ہیں:

''یہاں ایک خاص نکتہ پیش نظر رکھنا چاہیے' شاعری اور انشا پردازی تمدن کے ساتھ ساتھ چلتی ہے یعنی جس قسم کا تمدن ہوتا ہے اسی قسم کی شاعری بھی ہوتی ہے- قوم کی ابتدائی ترقی کا جو زمانہ ہوتا ہے' اس وقت شاعرانہ خیالات سادہ ہوتے ہیں- جب قوم ترقی کرتی ہے اور تمام شریفانہ جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں تو گو شاعری میں جوش اور زور پیدا ہو جاتا ہے لیکن اب بھی سچائی اور راستی کے مرکز سے نہیں ہٹتی کیونکہ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب قوم ہمہ تن عمل ہوتی ہے- اس کے بعد جب عیش اور ناز ونعمت کی نوبت آتی ہے تو ہر ہر بات میں تکلف' ساخت اور آورد پیدا ہو جاتی ہے- یہی زمانہ ہے جب شاعری میں مبالغہ پیدا ہو جاتا ہے-(۲۸)''

شبلی کہتے ہیں کہ جو لوگ مبالغہ کو لازمہء شعر قرار دیتے ہیں اور شاعری سے استدلال کرتے ہیں' یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ کس دور کی شاعری سے مثال دیتے ہیں- اگر شعرائے متاخرین کی شعری مثال دی گئی ہے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ تمدن کے اثر سے نہ صرف شاعری پر برے اثرات مرتب ہوئے ہیں بلکہ لوگوں کے مذاق شعر پر بھی کہ وہ مبالغہ پسند کرنے لگے-

شبلی کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ صرف حصول مسرت کو ہی شعر کا مقصد سمجھتے تھے اور اصلاح احوال سے قطع نظر کرتے تھے- لیکن شبلی کی تنقید پڑھتے ہوئے کئی مقامات پر اس کی تردید ہو جاتی ہے- مثلاً اسی واقعیت کے بارے میں ہی لکھتے ہیں:

''شاعری سے اگر تفریح مقصود ہو تو مبالغہ کام آ سکتا ہے لیکن وہ شاعری جو ایک طاقت ہے' جو قوموں کو زیر و زبر کر سکتی ہے' جو ملک میں ہلچل ڈال سکتی ہے جس سے عرب قبائل میں آگ لگا دیتے تھے' جس سے نوحہ کے وقت در و دیوار سے آنسو نکل پڑتے تھے' وہ واقعیت و اصلیت سے خالی ہو تو کچھ کام

نہیں کر سکتی۔(۲۹)''

شبلی کا دور مسلمانوں کے صرف سیاسی زوال کا دور ہی نہیں ہے بلکہ اخلاقیات کے حوالے سے بھی مسلمان بے شمار برائیوں کا شکار ہو چکے تھے۔ منافقت، کم ہمتی، بزدلی، جھوٹ، فریب، کم علمی، غلامی، بے حسی، جمود، غرض ہر طرح کی انسانی خامی ان کے کردار میں پیدا ہو چکی تھی جس کی وجہ سے وہ زوال کی پست ترین سطح تک پہنچ چکے تھے۔ اس دور کے دوسرے مفکرین کی طرح شبلی بھی چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے کردار کی خامیوں کی اصلاح کریں اور ایک غیرت مند قوم کی طرح اعلیٰ انسانی نصب العین کے حصول کی جدوجہد میں شریک ہوں۔ اس لیے اپنی تمام تر جمال پسندی کے باوجود وہ مصلح قوم بھی تھے اور شاعری کو اعلیٰ اخلاقی کمالات پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ سمجھتے تھے۔ گویا وہ سوسائٹی پر شاعری کے اثرات کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ جو کام اس سلسلے میں شاعری سے لیا جا سکتا ہے، وہ کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''شریفانہ اخلاق پیدا کرنے کا شاعری سے بہتر کوئی آلہ نہیں ہو سکتا۔ علم اخلاق ایک مستقل فن ہے اور فلسفہ کا جزو اعظم ہے۔ ہر زبان میں اس فن پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اخلاقی تعلیم کے لیے ایک شعر ضخیم کتاب سے زیادہ کام دے سکتا ہے۔ شاعری ایک موثر چیز ہے اس لیے جو خیال اس کے ذریعے سے ادا کیا جاتا ہے دل میں اتر جاتا ہے اور جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے۔ اس بنا پر اگر شاعری کے ذریعے سے اخلاقی مضامین بیان کیے جائیں اور شریفانہ جذبات مثلاً شجاعت، ہمت، غیرت، حمیت، آزادی کو اشعار کے ذریعہ سے ابھارا جائے تو کوئی اور طریقہ برابری نہیں ہو سکتا۔(۳۰)''

اخلاق کے ضمن میں حالی بھی قومی افتخار اور قومی عزت کی بات کرتے ہیں اور شبلی اسے غیریت، حمیت اور آزادی کا نام دیتے ہیں۔ بات ایک ہی ہے۔ دونوں ہی اپنی قوم کی موجودہ

حالت سے مطمئن نہیں ہیں اور اسے تبدیل کرنا چاہتے ہیں- اس مقصد کے لیے انھوں نے دیگر ذرائع بھی اختیار کیے- اس حوالے سے خود بھی شاعری کی اور اپنی تنقید کے ذریعے اپنے دور کے شاعروں کو بھی اس طرف متوجہ کیا- یہی وجہ ہے کہ شبلی شاعری کا ایک منصب شریفانہ اخلاق کی تعلیم بھی بتاتے ہیں-

شبلی طرز معاشرت کے شعروادب پر اثرات کے بھی قائل تھے- ان کا عربی و فارسی شاعری کا مطالعہ بہت گہرا تھا- اس کے ساتھ ہی ان کا ذہن منطقی اور تجزیاتی بھی تھا- جب انھوں نے یہ دیکھا کہ مختلف ادوار کی شاعری موضوعات اور اسلوب کی سطح پر مختلف ہے تو انھوں نے اس پر غور وفکر کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مختلف ادوار میں تمدن میں جو تبدیلیاں آتی ہیں' وہ زندگی کے تمام شعبوں' عوام کی نفسیات اور طرز زیست کے ساتھ شاعری پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں- اسی نتیجہء فکر کا اظہار انھوں نے ''واقعیت'' کے ذیل میں بھی کیا ہے- آگے چل کر وہ ''شاعری کا تدریجی ارتقا'' کے عنوان سے بھی اسی موضوع پر لکھتے ہیں- اسی حوالے سے ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> ''عرب کی اصلی شاعری اسلام سے بہت پہلے شروع ہو کر بنوامیہ کے زمانے تک ختم ہو چکی تھی- اس کے بعد عربی حکومت کا مرکز بغداد قرار پایا- یہاں عجم سے اس قدر اختلاط ہوا کہ عرب کا سارا تمدن بدل گیا اور اس کے ساتھ ہی ان کی شاعری بھی سرے سے بدل گئی- خیالات' طرز ادا' استعارات' تشبیہات' نوعیت' مضامین' قصائد اور غزل کا سرمایہء خمیر سب کا سب بدل گیا-(۳۱)''

شبلی شاعری پر ''نظام حکومت کا اثر'' کے حوالے سے کہتے ہیں کہ شخصی اور خودمختار حکومتوں کے فارسی شاعری پر بہت مثبت اثرات مرتب ہوئے اور ایسے ادوار میں شاعری نے خوب ترقی کی- اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ شاعری نہ صرف تقرب سلطانی کا ذریعہ تھی بلکہ انعام وکرام کے حصول کا ذریعہ بھی- ایرانی بادشاہ شاعروں کی بے حد قدر ومنزلت کرتے تھے اور انھیں اپنے برابر تخت پر بٹھاتے

تھے۔شبلی نے بہت سی مثالوں سے بتایا ہے کہ کس طرح بادشاہ شاعروں کی قدر کرتے تھے۔ کتنے بیش قیمت انعامات سے نوازتے تھے۔اس کا اثر یہ ہوا کہ شاعری نے خوب ترقی کی۔ لکھتے ہیں:

''یہ فیاضیاں اصول سلطنت کے لحاظ سے جائز تھیں یا ناجائز' اس کا فیصلہ شاعری کی تاریخ سے تعلق نہیں رکھتا لیکن اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اس نے شاعری کی ترقی اور وسعت میں آب حیات کا کام دیا۔ تمام ملک میں شاعری کا مذاق پھیل گیا۔ بڑے بڑے حکماء اور علماء علوم وفنون چھوڑ کر شاعر بن گئے۔ یہ فیاضیاں نہ ہوتیں تو اقلیم سخن کو خیام' انوری' نظامی' ناصر' خسرو' فیضی کہاں سے ہاتھ آتے۔لیکن شاعری کی ترقی میں فیاضی سے بڑھ کر جس چیز نے کام کیا وہ سلاطین اور امراء کی قابلیت اور نکتہ سنجی تھی۔(۳۲)''

مولانا حالی اور ترقی پسند نقادوں کا نقطۂ نظر اس کے برعکس ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شخصی اور خودمختار حکومتوں میں شاعری زوال کا شکار ہوتی ہے کیونکہ شاعر مطلق العنان بادشاہوں کے زیر اثر شعر کہتے ہیں اور انھیں وہ آزادی نصیب نہیں ہوتی جو اعلیٰ شاعری کی تخلیق کے لیے ضروری ہوتی ہے۔شبلی نے بھی اس بات کا اقرار کیا ہے کہ ان ادوار میں زیادہ تر قصیدہ اور مثنوی کو فروغ حاصل ہوا اور مثنوی کا موضوع بھی زیادہ تر انہی بادشاہوں کی جنگوں کی رزمیہ واقعات نگاری تک محدود تھا۔شبلی نے شاعروں کی بادشاہوں نے جو قدر و منزلت کی' اس کے بارے میں واقعات نقل کیے ہیں۔ جبکہ حالی نے وہ واقعات بیان کیے ہیں جن میں بادشاہوں نے شاعروں کو بے عزت کیا۔ بادشاہ نازک مزاج ہوتے تھے۔ جب چاہتے خوش ہو کر انعام و اکرام سے نواز دیتے اور جب چاہتے ذرا سی بات پر بگڑ کر عتاب کا نشانہ بنا دیتے۔

شبلی نے ادب و شعر پر تمدن اور معاشرت کے اثرات کے حوالے سے بہت تفصیلی بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے پیش نظر ایرانی شاعری زیادہ رہی ہے۔ انھوں نے مختلف ادوار کے تمدن

کا جائزہ لے کر یہ بتایا ہے کہ اس کا اثر زبان اور شاعری پر کس طرح پڑا- فوجی زندگی کے اثرات کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ایران میں جس زمانے میں شاعری شروع ہوئی' وہ فوجی معرکوں اور فتوحات کا زمانہ تھا- بچہ بچہ سپاہی تھا- ہر حکومت کو اپنی بقا کے لیے ہمہ وقت تیغ بکف رہنا پڑتا تھا- اس دور میں فارسی شاعری نے سمرقند' بخارا' غزنیں' خوارزم میں ترقی پائی- یہاں کی آب و ہوا سپہ گری' بہادری اور جانبازی کا اثر رکھتی تھی- اس لیے اس دور کی شاعری میں قصیدہ و مثنوی کا رواج ہوا- شکار کے موضوع شاعری میں در آئے- اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری کی زبان بالکل فوجی زبان بن گئی- مثلاً زدن کے اصلی معنی مارنے کے ہیں- اس سے بیسیوں اصطلاحی معنی پیدا ہو گئے- حرف زدن مشل زدن' مے زدن' فال زدن' نوا زدن' گام زدن' دم زدن اور گرہ زدن وغیرہ- چراغ بجھانا چراغ کشتن' پہاڑ کی چوٹی تیغ کوہ جیسی مثالیں اس فوجی تمدن کی یادگار میں جو کبھی ایران میں قائم تھا- بعد میں جب فوجی طاقت کم ہوگئی اور جنگ جو فطرت تمدن آشنا ہوئی اسی زبان میں حسن و عشق و تصوف کے استعارے وضع ہو گئے- لکھتے ہیں:

> ''ملکی حالت کے بدلنے نے ملک کی زبان بدل دی- ایک دقیق راز ہے کہ ملک کی جو مادی حالت ہوتی ہے زبان پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے- جس ملک میں زیادہ تر لڑائیاں رہتی ہوں' ہر وقت جنگ و جدل کا چرچا رہتا ہو' آنکھیں کھولنے کے ساتھ بچوں کی نظر تیغ و خنجر پر پڑتی ہو وہاں کی زبان بھی اسی قسم کی بن جاتی ہے..... متاخرین کی زبان چونکہ غزل کی زبان بن گئی اس لیے قصیدہ کی وہ شان نہ رہی- مثنوی پر بھی اثر پڑا..... تشبیہات و استعارات بدل گئے..... ساتویں صدی کے آغاز ہی میں اسلامی طاقت گویا برباد ہوگئی اور اس وجہ سے قوم کا شیرازہ بالکل بکھر گیا- اس نے یہ اثر پیدا کیا کہ ملک کی زبان پر فحش گوئی اور بدتہذیبی چھا گئی- (۳۳)''

مفتون احمد نے اپنی کتاب مولانا شبلی نعمانی' ایک مطالعہ کی تمہید میں شبلی کے عمرانی رجحانات کی نشاندہی کی ہے- لکھتے ہیں:

''دوسری چیز جو شبلی کے علاوہ سرسید کے تمام رفقا میں موجود ہے' عمرانی تغیر (Social change) کا احساس اور اظہار ہے جس میں ایک تہذیب کے ساتھ ساتھ دوسری نئی اور ترقی پذیر تہذیب ابھرتی ہے..... اس عمرانی تغیر کی جھلک مولانا کے پورے ادب میں ملتی ہے-(۳۴)''

شبلی نے معاشرت کے اختلاف کے شاعری پر اثرات کا جائزہ بھی لیا ہے- وہ کہتے ہیں شہر اور دیہات کی طرز معاشرت میں جو فرق ہے اگر شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ فرق صاف صاف تلاش کیا جا سکتا ہے- دیہات کی فضا خالص اور تصنع سے پاک ہوتی ہے جبکہ شہر کی معاشرت اس کے برعکس ہوتی ہے اور یہ فرق شاعری میں بھی نظر آتا ہے-

اسی طرح ایک ہی زبان کی شاعری مختلف ملکوں میں مختلف خصوصیات کی حامل ہوتی ہے- سمرقند' بلخ غزنیں' شیراز و اصفہان اور ہندوستان میں ہونے والی فارسی شاعری مختلف اسلوب و انداز کی حامل ہے- ان میں پائے جانے والے فرق کو صاف صاف بیان کیا جا سکتا ہے- غزنیں اور سمرقند وغیرہ کے شعراء پختہ گو اور سادہ گو ہیں- شیراز و اصفہان کے شعرا کا کلام نزاکت و لطافت کا حامل ہے- اسی طرح ایران سے آنے والے فارسی شعرا نے جب ہندوستان کی معاشرت میں رہ کر شعر کہے تو ان کی شاعری اور ایران کے فارسی شعرا کی شاعری میں زمین و آسمان کا فرق ہے- معاشرت کے اختلاف سے شاعری میں جو تبدیلی آتی ہے اس کے حوالے سے وہ عربی فارسی شاعری کا موازنہ بھی کرتے ہیں- وہ کہتے ہیں کہ عربی شاعری کے فارسی شاعری پر بڑے گہرے اثرات ہیں لیکن تمدن و معاشرت کے فرق کی وجہ سے دونوں زبانوں کی شاعری ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے- مقالات شبلی جلد دوم میں ''عربی فارسی شاعری کا موازنہ'' کے عنوان سے انھوں

نے جو مضمون لکھا ہے، اس میں لکھتے ہیں:

''عرب کی شاعری اس بات میں بھی ایران سے ممتاز ہے کہ عرب کا شاعر معاشرت اور خانگی زندگی کی خصوصیات اس قدر بیان کرتا ہے کہ اس سے اس زمانہ کی رفتار و گفتار، نشست و برخاست، وضع قطع، رہنے سہنے کے طریقے، زندگی کی ضرورتیں، اسباب خانہ داری، ایک ایک چیز کا حال معلوم ہوسکتا ہے۔ بخلاف اس کے فارسی شاعری میں یہ بھی معلوم نہیں ہوسکتا کہ لوگ زمین پر رہتے تھے یا آسمان پر بسر کرتے تھے۔(۳۵)''

معاشرے کے شاعری پر اثرات کے حوالے سے شبلی نے جو بحثیں کی ہیں اور معاشرت کے جن پہلوؤں پر بات کی ہے اور تفصیل اور شواہد کے ساتھ جو استدلالی انداز انھوں نے اختیار کیا ہے، اس حوالے سے اس موضوع پر انھیں حالی پر بھی فوقیت حاصل ہوگئی ہے۔ حالانکہ حالی کی تنقید کی بنیاد ہی معاشرت پر استوار ہے۔عبدالشکور لکھتے ہیں:

''ہمیں اپنی توجہ زیادہ تر شعرالعجم جلد چہارم پر مرکوز رکھنا ہے جس میں تفصیل کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ ایران کی آب و ہوا اور تمدن اور دیگر اسباب نے شاعری پر کیا اثر کیا اور کیا کیا تغیرات پیدا کیے۔ اس کے ساتھ ہر دور کی خصوصیات کی تشریح اور شاعری کے تمام انوع پر مفصل تقریظ اور تنقید ہے۔(۳۶)''

شبلی شعرو ادب پر آب و ہوا کے اثرات کا تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ طرز معاشرت اور شاعر کی اعلیٰ نسبی کے ساتھ ہر ملک کی آب و ہوا کے اثرات بھی اس ملک کی زبان اور شاعری دونوں پر پڑتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں کی زبان پر پہاڑوں کی سختی کے اثرات، صحراؤں کے رہنے والوں کی زبان وشعر میں صحرائی اثرات ضرور ہوں گے۔شبلی ایران اور عرب کی آب و ہوا

کے تخالف کے اثرات ان ملکوں کی شاعری میں پائی جانے والی تفریقات کے حوالے سے دیکھتے ہیں- لکھتے ہیں:

''عرب جاہلیت کا کلام دیکھو تو پہاڑ' صحرا' جنگل' بیاباں' دشوار گزار رستے' مٹے ہوئے کھنڈر' ببولوں کے جھنڈ' پہاڑی جھاڑیاں' یہ چیزیں ان کی شاعری کا سرمایہ ہیں- لیکن یہی عرب جب بغداد پہنچے تو ان کا کلام چمنستان اور سنبلستان بن گیا- ایران ایک قدرتی چمن زار ہے- ملک پھولوں سے بھرا پڑا ہے- قدم قدم پر آب رواں' سبزہ زار اور آبشاریں ہیں- بہار آئی اور تختہ زمین تختہء زمردیں بن گیا- باد سحر کے جھونکے' خوشبوؤں کی لپٹ' سبزہ کی لہک' بلبلوں کی چہک' طاؤس کی جھنکار' آبشاروں کا شور وہ سماں ہے جو ایران کے سوا اور کہیں نظر نہیں آتا-

اس حالت کا اثر یہ ہوا کہ ایران کی انشاء پردازی پر رنگینی چھا گئی- کسی چیز کی خوبی یا کمال کو بیان کرنا چاہیں تو رنگ و بو کے ذریعہ کام لیں گے-(۳۷)''

ان کے خیال میں شاعر جس معاشرے اور فضا میں شعر کہتا ہے جن مادی حالات میں بسر کرتا ہے- وہ اس کے تخلیقی کام پر ٹھوس اثرات مرتب کرتے ہیں- جن کی نشاندہی اس کے موضوعات اور استعارات و علامات سے کی جا سکتی ہے- یہ بڑی حیران کن حقیقت ہے کہ اردو تنقید نے اپنے ابتدائی زمانے میں ہی ایسے مباحث آغاز کیے جو دیگر کئی ترقی یافتہ زبانوں نے سینکڑوں سالوں کے سفر کے بعد محسوس کیے- اگرچہ حالی اور شبلی کا مغربی ادب کا مطالعہ بھی تھا لیکن وہ کچھ اتنا نہیں تھا کہ ہم ان نظریات کو مغربی تنقید کے اثرات کہہ سکیں- یہ مباحث زیادہ تر ان کے عہد کے مسائل اور صورت حال کی وجہ سے ان کی فکر کا حصہ بنے-

شعر العجم جلد چہارم کے تیسرے باب میں انھوں نے فارسی شاعری پر انہی اصولوں کی روشنی

میں تبصرہ کیا جن کا ذکر ہم گزشتہ صفحات میں کر آئے ہیں- وہ اصناف سخن کا جائزہ لیں یا شعرا کا' اپنے تنقیدی پیمانوں سے لیتے ہیں- وہ شاعری کو اسلوب کے حوالے سے تخیل' محاکات اور شعری کمالات مثلاً صنائع بدائع' تشبیہ' استعارہ' الفاظ کا برمحل استعمال اور جدت ادا کے پیمانوں سے ناپتے ہیں اور اس کا موضوعاتی مطالعہ معاشرتی اثرات کے پس منظر میں کرتے ہیں- اس طرح حالی اور شبلی کی تنقید کا بنیادی فرق یہ ہے کہ حالی موضوع پر زیادہ اصرار کرتے ہیں جبکہ شبلی موضوع کے ساتھ اسلوب کی اہمیت کے بھی قائل ہیں- بلکہ اسلوب ان کے لیے زیادہ اہم ہے- اسی باب کے آخر میں انھوں نے ''شاہنامہ'' کا مطالعہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت کیا ہے- شاہنامہ کی تاریخی حیثیت' شاہنامہ ایک جامع انسائیکلو پیڈیا' شاہنامہ اور نظام حکومت' تہذیب و تمدن' فن جنگ' شاہنامہ اور کریکٹر' حکمت اور اخلاق' موعظمت اور اخلاق' آزادی رائے' عورتوں کی قدر و منزلت' شاہنامہ اور مذہب' شاہنامہ اور فن بلاغت' جذبات- یہ تمام عنوانات ان کے تنقیدی شعور کی مکمل عکاسی کرتے ہیں- ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے جو نظری پیمانے ادب کی تفہیم کے لیے مقرر کیے ہیں' شاہنامہ کا جائزہ بھی انہی کی روشنی میں لیا ہے- گویا ان کی نظری تنقید اور عملی تنقید میں یہاں کوئی فرق نہیں ہے-

بڑے آدمیوں سے اختلاف ان کی فکری عظمت کی دلیل ہوتی ہے- شبلی کے تنقیدی نظریات سے بھی کئی مقامات پر اختلاف کیا گیا تو کئی حوالوں سے انھیں سراہا بھی گیا- یہ کم ہی ہوتا ہے کہ کسی کے نظریات سے کلی طور پر اتفاق کر لیا جائے- شبلی کی تنقیدی فکر سے اختلافات رکھنے کے باوجود تمام نقادوں نے ان کی تنقیدی بصیرت اور اردو تنقید میں ان کے اضافوں کا اعتراف کیا ہے- شبلی نے جن تنقیدی مباحث کو موضوع بنایا- وہ ایسے ہیں کہ ہمیشہ ان پر بات ہوتی رہے گی اور زمانوں کی تبدیلی سے ان میں اضافے اور نئے نئے نکتے بھی پیدا ہوتے رہیں گے- لیکن شبلی کی اہمیت اپنی جگہ قائم رہے گی- محمد واصل عثمانی اپنی کتاب ''شبلی ادیبوں کی نظر میں'' میں ان کی تنقیدی

بصیرت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''شبلی کے تنقیدی شعور کی پرورش و پرداخت اور نشوونما میں خارجی حالات کو دخل تھا- علاوہ ازیں ان کا وسیع مطالعہ، دقیقہ رس ذہن اور سلجھا ہوا فلسفیانہ دماغ انھیں بنیادی طور پر ایک قابل توجہ اور فخر معاصر نقاد بنانے کے لیے کافی ہے- وہ ابتدا ہی سے اپنا ایک زاویہء نگاہ رکھتے تھے- چیزوں کو سمجھنے اور سمجھانے کا طور طریقہ بھی ان کے پاس کافی تھا- لوگوں سے متاثر ہونے کے باوجود ان کی اندھا دھند تقلید کے وہ کبھی قائل نہیں رہے-(۳۸)''

مولانا محمد حسین آزاد کو اپنے دیگر دونوں ہم عصر نقادوں پر یہ تفوق حاصل ہے کہ انھوں نے اردو تنقید نگاری پر ان دونوں سے پہلے قلم اٹھایا- آب حیات ۱۸۸۸ء میں شائع ہوئی جبکہ مقدمہ شعروشاعری ۱۸۹۳ء اور شعرالعجم جلد چہارم جس میں تنقید پر نظری بحثیں کی ہیں-۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی- اولیت کا اعزاز پانے کے باوجود آزاد کا زیادہ تر کام لسانیات پر ہے- اردو تنقید پر اپنے ہم عصروں حالی وشبلی کی طرح انھوں نے کوئی باقاعدہ کتاب نہیں چھوڑی- اسی لیے ہم نے آزاد کا ذکر ان دونوں کے بعد کیا ہے- آزاد کو عام طور پر تذکرہ نگار سمجھا جاتا ہے اور بطور نقاد ان کا ذکر کم کیا جاتا ہے-

آزاد کی تنقید میں آب حیات کو بنیادی مقام حاصل ہے- اس کتاب میں ہمیں تذکرہ نگاری، تاریخ نگاری اور تنقید نگاری کا حسین امتزاج نظر آتا ہے- آزاد سمیت تمام ہی تذکرہ نگاروں نے شعراء کے حالات زندگی اور عہد کی مجموعی صورت حال کو تو بیان کیا ہے- لیکن ان کے فن پر ہونے والے اثرات کا جائزہ نہیں لیا لیکن اس کے باوجود انھوں نے بعد میں آنے والے نقادوں کے لیے مفید مواد ضرور فراہم کر دیا ہے- آزاد نے آب حیات میں شاعروں کی زندگی کے جو مرقع تخلیق کیے ہیں وہ زندہ اور چلتے پھرتے ہیں- اگر چہ بعض محققوں نے اس میں بہت سی خامیوں کا ذکر کیا ہے- لیکن اس کے باوجود آج بھی اس کی اہمیت میں کمی واقع نہیں ہوئی- ڈاکٹر محمد صادق نے اس

حوالے سے بہت قیمتی کام کیا ہے- وہ کہتے ہیں کہ آزاد پر یہ اعتراضات اس وقت ہوئے جب بہت سے تذکرے منظر عام پر نہیں آئے تھے- ان تذکروں کے سامنے آنے کے بعد آزاد کے کام کی وقعت اور واقعیت دونوں میں اضافہ ہوا ہے- آزاد کو دیگر تذکرہ نگاروں پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ انھوں نے تذکروں سمیت ہر ممکنہ مواد سے کام لے کر شاعروں کے تفصیلی خاکے بنائے ہیں-

آزاد کا یہ نقطۂ نظر معلوم تھا کہ زبان و ادب عہد بہ عہد بدلتے رہتے ہیں اور ان پر ان کے عہد کے تصورات نظریات، رجحانات اور انداز زیست کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں- یہی نہیں بلکہ مختلف طبائع کے حامل تخلیق کاروں کے اختلاف طبیعت کا اثر بھی گہرا ہوتا ہے جس کی وجہ سے مختلف شاعروں کی شاعری مختلف ہوتی ہے- یہ گہرا تنقیدی شعور آزاد نے لسانیات کے مطالعے سے حاصل کیا- انھوں نے دیکھا کہ ایک ہی زبان مختلف شہروں، ملکوں، آب و ہوا اور ادوار میں مختلف ہو جاتی ہے اور اس میں الفاظ کا مزاج بدل جاتا ہے- آزاد الفاظ کو بے جان شے نہیں سمجھتے تھے بلکہ ایک ذی روح اور جاندار چیز گردانتے تھے- اس حوالے سے ڈاکٹر سجاد باقر رضوی لکھتے ہیں:

> ''آزاد نے لفظوں کی زندگی کو انسانی زندگی کے مماثل قرار دے کر اپنے بیان کو قاری کا بھرپور تجربہ بنا دیا ہے اور انسانی معاشرت میں لفظوں کے کردار کی اہمیت کو نہایت جامع انداز میں پیش کیا ہے- اس طرح پڑھنے والے کو محض چند اطلاعات نہیں ملتیں بلکہ اسے لفظوں کا تجربہ نصیب ہوتا ہے- جو زندگی کی طرح اہم ہے- یہی آزاد کا اسلوب خاص ہے جس کے باعث ان کی نثر میں زندگی رواں دواں نظر آتی ہے-'' (۳۹)

آب حیات میں جدید طرز تحریر کا اردو زبان سے موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اردو زبان کی سب سے بڑی خامی مبالغہ آرائی ہے- اردو ادیب واقعیت کی بجائے رنگین الفاظ اور نازک مضمونوں کی بھول بھلیوں میں جا نکلتے ہیں- جس سے ان کی تحریر میں تاثیر پیدا ہونے کے بجائے اسے لفظوں کا گورکھ دھندہ بنا دیتی ہے جس میں تقریر کا مدعا عنقا ہوتا ہے- ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اردو نے ماضی میں جو ترقی کر لی ہے وہ ماضی کے صاحبان علم و فن کی عصری بصیرت کے ذریعے ممکن ہوئی اور اگر اب اردو زبان و ادب کو آگے بڑھنا ہے تو اسے اپنے عہد کی ضرورتوں اور معاملات کا

ساتھ دینا ہوگا لکھتے ہیں:

''انگریزی تحریر کے عام اصول یہ ہیں کہ جس شے کا حال یا دل کا خیال لکھئے تو اس طرح ادا کیجیے کہ خود وہ حالت گزرنے سے یا اس کے مشاہدہ کرنے سے جو خوشی یا غم یا غصہ یا رحم یا خوف یا جوش دل پر طاری ہوتا یہ بیان وہی عالم اور وہی سماں دل پر چھا دیوے۔

بے شک ہماری طرز بیان اپنی چست بندشوں اور قافیوں کے مسلسل کھٹکوں سے کانوں کو اچھی طرح خبر کرتی ہے۔ اپنے رنگین الفاظ اور نازک مضمونوں سے خیال میں شوخی کا لطف پیدا کرتی ہے۔ ساتھ اس کے مبالغہ کلام اور عبارت کی دھوم دھوم سے زمین آسمان کو تہ و بالا کر دیتی ہے۔ مگر اصل مقصود یعنی دلی اثر یا اظہار واقعیت ڈھونڈو تو ذرا نہیں چند مضمون ہیں کہ ہماری زبانوں پر رواں ہیں۔ مگر حقیقت میں ہم ان میں بھی ناکام ہیں۔'' (۴۰)

انشاء پردازی آزاد کا خاص میدان ہے۔ درج بالا اقتباس میں انھوں نے انشاء پردازی کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے' ان کا بنیادی نظریہ ہے' ان خیالات کا اعادہ انھوں نے مختلف مضامین میں بار بار کیا ہے۔ نیرنگ خیال کے دیباچے کی اردو انشاء پردازی کی تنقید میں خاص اہمیت ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو وہاں بھی انھوں نے وہی خیالات دہرائے ہیں جن کا اظہار انھوں نے آب حیات میں کر دیا تھا۔

اپنے ایک اور مضمون ''زبان اور اردو'' مطبوعہ رسالہ انجمن قصور ماہ دسمبر ۱۸۷۵ء میں وہ اسی بات کو یوں آگے بڑھاتے ہیں۔

''اگر شائستہ قوموں کی انشاء پردازی سوال کرے کہ اردو کی انشاء کیوں اس حالت میں مبتلا رہی؟ تو حاضر جواب فوراً بول اٹھے گی کہ قوم کی انشاء پردازی بموجب اس کے خیالات کے ہوتی ہے اور خیالات اس کے بموجب حالات ملک اور تربیت ملکی کے ہوتے ہیں۔ جیسے ہندوستان کی تعلیم اور شائستگی تھی اور بادشاہوں اور امیروں کی قدردانی تھی۔ ویسی ہی انشاء پردازی رہی اور خاتمہ

کلام اس فقرے پر ہوگا کہ کوئی پرندہ اپنے بازوؤں سے بڑھ کر پر نہیں مار سکتا- اس کے بازو فارسی' سنسکرت' بھاشا وغیرہ تھے پھر اردو بے چاری انگلینڈ یا روم یا یونان کے محلوں پر کیونکر جا بیٹھتی''(۴۱)

دیکھا جائے تو نیرنگ خیال کا دیباچہ اور مقالات آزاد کے ادبی مضامین زیادہ تر یا تو من وعن آب حیات کے پہلے حصے سے لے لیے گئے ہیں یا انھیں خیالات سے ماخوذ ہیں- گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولانا محمد حسین آزاد کے تنقیدی نظریات ۱۸۸۸ء آب حیات کی اشاعت تک ایک ہی رہے اور ان میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی- آزاد مزاجاً حالی وسرسید کی نسبت شبلی کے زیادہ قریب تھے- مندرجہ بالا تینوں اقتباسات سے ہم جس نتیجے پر پہنچتے ہیں وہ یہ ہے کہ آزاد بے جا مبالغہ آرائی کے تو خلاف تھے لیکن بقدر نمک استعارات اور کلام کے دیگر محاسن کے قائل تھے- وہ کہتے ہیں کہ ادیب کو عبارت آرائی میں گم ہونے کے بجائے اپنے موضوع پر بھی بھرپور توجہ دینی چاہیے- موضوعات کے حوالے سے وہ جدید خیالات اور عصری آگاہی کو اہمیت دیتے تھے- واقعیت اور اصلیت کے حوالے سے سرسید سے آزاد تک چاروں نقادوں کا نقطۂ نظر ایک ہے- آزاد نے آب حیات میں مختلف ادوار کی خصوصیات سے بھی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ زبان وادب مختلف ادوار میں کن کن تبدیلیوں سے گزرتے رہے ہیں- آزاد ادب اور شاعری پر بحث کے ساتھ ساتھ زبان میں ہونے والی تبدیلیوں کو بھی اہمیت دیتے ہیں- آب حیات پر ڈاکٹر طیبہ خاتون نے بڑی مناسب بحث کی ہے اور اس کی خوبیوں خامیوں کا خوب احاطہ کیا ہے-

''نیرنگ خیال میں اردو نثر پر انھوں نے اظہار خیال کیا ہے اور آب حیات میں اردو شاعری پر لیکن ان کتابوں کے دیباچوں میں دونوں جگہ زبان سے بحث کی ہے- اس لحاظ سے کہ یہ اردو ادب کی پہلی تنقیدی تصانیف ہیں' اس میں تحقیقی غلطیوں کے باوجود انھیں آج بھی تنقید کے نقطۂ نظر سے اہم سمجھا جاتا ہے-''(۴۲)

شبلی سے آزاد کی ایک اور مماثلت بھی ہے اور وہ یہ کہ شبلی نے بھی زبان اور ادب پر معاشرت، اختلاف معاشرت، تمدن، آب و ہوا اور لوگوں کی نفسیاتی کیفیات کے اثرات کا مطالعہ کیا اور یہی کام آزاد نے ''سخندان فارس'' میں کیا ہے- آزاد کو ویسے بھی لسانیات سے غیر معمولی دلچسپی تھی- جس کا اظہار سخندان فارس کے علاوہ آب حیات سے بھی ہوتا ہے- ''سخن دان فارس'' میں ان کا ساتواں لیکچر اس موضوع پر ہے کہ ہر ملک اور اس کے موسم کس طرح انشا پردازی پر اثر انداز ہوتے ہیں لکھتے ہیں:

> ''میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہر ایک انشا پردازی اپنے ملک کی سرزمین آب و ہوا اور پیداوار بلکہ اس کے جغرافیہ کو آئینہ کی طرح دکھاتی ہے- کیونکہ جو چیزیں انشاء پرداز کو آس پاس نظر آتی ہیں انہی کو وہ ادائے مطلب کے سامان میں خرچ کرتا ہے-'' (۴۳)

اپنی بات کی وضاحت میں وہ آگے لکھتے ہیں کہ انشا پرداز اپنے ماحول کا پابند ہوتا ہے- یہ پابندی کوئی باہر سے عائد نہیں کرتا بلکہ جس ماحول میں وہ زندگی گزارتا ہے، وہ اس پر اس قدر حاوی ہوتا ہے کہ اس کے استعارات و تشبیہات سے اپنا اظہار کرتا ہے- اس سلسلے میں وہ ایک مثال دیتے ہیں کہ چاند کو سنار دیکھے تو کندن کہے گا، پنیر والہ پنیر کا ٹکڑا اور نانبائی روٹی سے تشبیہ دے گا- اس کے بعد وہ عرب، ہندوستان، فرنگ اور فارس کی تہذیبوں کے اختلاف کو انشا پردازی کے حوالے سے واضح کرتے ہیں-

آزاد کہتے ہیں ایران ٹھنڈا ملک ہے اس لیے آگ ان کے لیے خصوصی اہمیت کی حامل ہے- وہ باعث آرام ہی نہیں ہے بلکہ بعض اوقات باعث زندگی بن جاتی ہے- اس لیے اس لفظ کو ان کی زبان میں بھی خاص اہمیت حاصل ہے- یہی وجہ ہے کہ اس ایک لفظ سے بیسیوں تراکیب مروج ہیں- مثلاً آتش بیان، آتش زبان، آتش سخن، آتش مزاج، آتش کار، آتش لباس، آتش سرد، آتش پیکر وغیرہ اسی طرح سردی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''برخلاف اس کے سردی سے لوگوں کے کاروبار رک جاتے ہیں- فوائد میں نقصان آتے ہیں- پھرتے' چلتے' بیٹھتے' اٹھتے تکلیف اٹھاتے ہیں- یہی سبب ہے کہ جن الفاظ سے سردی ترکیب پاتی ہے معنوں میں بھی کمی' بےلطفی اور خرابی پیدا کرتی ہے- مثلاً وعدہ سرد' گریہء سرد' آہ سرد' ناز خنک' نوائے خنک' گفتار خنک' سرد شدن اختلاط (کمی محبت) سرد حرف' سرد زبان' سرد گوئے' سرد مہر' سرد نفس' خنک طبع' خنک ادا' خنک گفتار' خنک روے وغیرہ وغیرہ بہت الفاظ ہیں-'' (۴۴)

آزاد نے اس حوالے سے اور بھی بےشمار مثالیں دی ہیں- یہاں ہمارا مقصود آزاد کے نقطۂ نظر تک رسائی ہے- جس کے لیے یہی مثالیں بھی کافی ہیں- اس مقام پر آ کر شبلی اور آزاد میں ایک اور مماثلت پیدا ہو جاتی ہے- آزاد کی طرح شبلی بھی آب و ہوا اور معاشرت کے زبان و ادب پر اثرات کے قائل ہیں- لطف یہ ہے کہ ان کا طریقہ بیان اور طریقہ استدلال بھی بالکل آزاد کے مماثل ہے- سخن دان فارس کے حوالے سے ڈاکٹر محمد صادق نے شبلی کے تبصرے پر دلچسپ تبصرہ کیا ہے-

''آزاد کو شروع ہی سے لسانیات میں غیر معمولی دلچسپی تھی اور وہ اس موضوع پر مغربی محققین کی معلومات سے بھی کسی حد تک واقف تھے- لیکن اردو میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے امعان نظر سے اس کا مطالعہ کیا اور فارسی ادب میں اس کی نشاندہی کی اور دوسروں کے لیے مشعل راہ بنے- سخن دان فارس کی پہلی اشاعت پر شبلی نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا ''شکر ہے آزاد نے میرے موضوع کو نہیں چھوا'' لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ شعرالعجم کی چوتھی جلد بالکل انہی سطور پر لکھی گئی ہے اور وہی شعرالعجم کی روح رواں ہے-'' (۴۵)

ڈاکٹر آغا سہیل آزاد کے لسانیات پر کام کے معترف ہیں- ان کا نقطۂ نظر ہے کہ اگرچہ جدید

دور میں علم لسانیات نے بہت ترقی کر لی ہے اور جدید نظریات کی روشنی میں آزاد کے کام کا جائزہ لیا جائے تو شاید بہت سی خامیاں تلاش کر لی جائیں- لیکن یہ کام کسی طرح سے بھی مستحسن نہیں ہوگا- آزاد کے کام کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے دور اور اس دور کی حدود کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے- لکھتے ہیں:

''ان کی شہرہ آفاق کتاب سخندان فارس کی نسبت مجھے صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ اردو میں علم لسانیات یا زبانوں کے تقابلی مطالعہ پر یہ ایک پرمغز مقالہ ہے اور خوب اچھی طرح فارسی و سنسکرت دونوں زبانوں کا اس میں جائزہ لیا گیا ہے- موجودہ زمانے میں علم لسانیات کی ترقی یافتہ صورت کے پیش جو اعتراضات ماہرین لسانیات نے مذکورہ کتاب پر وارد کیے ہیں وہ اس لیے صحیح نہیں ہیں کہ

Phonetical study, phonemical study, morphological study اور Sementical study کے طریقے نہ تو اس زمانے میں دریافت ہوئے تھے اور نہ ان کا دریافت ہونا ممکن تھا- لہٰذا سخن دان فارس جو کچھ ہے اور جیسی ہے آزاد کی علمیت کی گواہ ہے اور ان کے کمال کی وقیع مثال ہے-'' (۴۶)

تنقید کے حوالے سے آزاد کے اس لیکچر کو بنیادی حیثیت حاصل ہے جو انھوں نے ''نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات'' کے عنوان سے انجمن پنجاب کے ایک جلسے میں دیا تھا- اس مضمون میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ ادب چونکہ کوئی جامد چیز ہے اور نہ زمانہ- وقت کے ساتھ ساتھ زندگی بدل جاتی ہے سو ادب کی اقدار میں بھی تبدیلی آنی چاہیے- اردو ادب چند موضوعات تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اور ان موضوعات کا بھی بدلتی ہوئی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے- اب وقت آ گیا ہے کہ شعوری طور پر یہ کوشش کی جائے کہ ادب واقعیت اختیار کرے اور اپنے زمانے

کے اہم مسائل اور معاملات کو موضوع کے طور پر استعمال کرے تا کہ اس کی افادیت اپنے زمانے کے لیے بھی قائم ہو- یہ لیکچر انھوں نے ۱۸۶۷ء میں دیا تھا- یہ وہ زمانہ تھا کہ نہ تو ابھی تہذیب الاخلاق جاری ہوا تھا جس نے ادب کی مقصدیت اور افادیت پر بہت زور دیا اور نہ ہی مقدمہ شعرو شاعری کا خیال حالی کے ذہن میں پیدا ہوا تھا- اس حوالے سے دیکھا جائے تو ادب کے ٹھوس مادی زندگی سے رشتے کی بات سب سے پہلے آزاد نے ہی کی تھی- انھوں نے اردو شاعری کی محدودیت اور دیگر نقائص کا ذکر کرتے ہوئے' ادب کی عصری قدروں پر زور دیا- لکھتے ہیں:

''اے گلشن فصاحت کے باغبانو! فصاحت اسے نہیں کہتے کہ مبالغے اور بلند پروازی کے بازوؤں سے اڑے- قافیوں کے پروں سے فرفر کرتے گئے اور شوکت الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے اور استعاروں کی تہہ میں ڈوب کر غائب ہو گئے- فصاحت کے معنی یہ ہیں کہ خوشی یا غم' کسی شے پر رغبت یا اس سے نفرت' کسی شے سے خوف یا خطر یا کسی پر قہر یا غضب غرض جو خیال ہمارے دل میں ہو اس کے بیان سے وہی اثر ہو' وہی جذبہ' وہی جوش سننے والوں کے دلوں پر چھا جائے جو اصل کے مشاہدے سے ہوتا ہے- بے شک مبالغے کا زور تشبیہ اور استعارے کی کمک زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر زیادہ کرتا ہے- لیکن نمک اتنا ہی چاہیے کہ جتنا نمک نہ کہ تمام کھانا نمک' تشبیہ اور استعارے ہمارے مطلب میں ایسے ہونے چاہئیں جیسے کسی معرکہ یا دربار یا باغ کی تصویر پر آئنہ کہ اس کی کیفیت کو زیادہ نمایاں کرے نہ اتنے آئنے کہ تصویر کا اصلی حال ہی نہ دکھائی دے- تب اس موقوع پر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ہمیں چاہیے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں- سادگی اور اظہار اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں- لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں کیونکہ اب رنگ زمانے کا کچھ اور

ہے- ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے کہ فصاحت و بلاغت کا کارخانہ کھلا ہے- جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے' ہار' طرے ہاتھوں میں لیے حاضر ہیں اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے- لیکن اب وہ بھی منتظر ہے کہ کوئی صاحب ہمت ہو جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے-'' (۴۷)

مولانا محمد حسین آزاد کے ادب کے بارے میں نظریات ان کے مختلف مضامین اور کتابوں میں پھیلے ہوئے ہیں- اگر چہ انھوں نے نئی تنقید کے حوالے سے کوئی مبسوط کتاب نہیں چھوڑی لیکن اس کے باوجود ان کے ادب کے بارے میں یہ بکھرے ہوئے خیالات بھی اپنی جگہ بے حد اہم ہیں- یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حالی و شبلی کے تنقیدی نظریات پر ان خیالات کا بھی اثر تھا-

☆☆☆☆

حوالہ جات

۱- ڈاکٹر عبادت بریلوی' اردو تنقید کا ارتقا' انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی' ۱۹۹۴' ص: ۲۶۱

۲- سرسید احمد خان' مقالات سرسید حصہ شانزدہم' مرتبہ: مولانا اسماعیل پانی پتی' مجلس ترقی ادب لاہور نومبر ۱۹۶۵ء' ص: ۲۰۹

۳- سرسید احمد خان' منتخبات تہذیب الاخلاق' مرتبہ: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار' مکتبہ خیابان ادب لاہور' س: جنوری ۱۹۶۷ء' ص: ۹۲

۴- ڈاکٹر آغا افتخار حسین' قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا مطالعہ' ص: ۱۰۶

۵- سرسید احمد خان' مقالات سرسید حصہ دہم' مرتبہ: مولانا اسماعیل پانی پتی' مجلس ترقی ادب لاہور' س: دسمبر ۱۹۶۲ء' ص: ۱۲۰

۶- ایضاً' ص: ۱۲۰

۷- خلیق احمد نظامی' سرسید احمد خان' پبلی کیشنز ڈویژن حکومت ہند دہلی' ۱۹۹۴ء' ص: ۱۰۸

۸- سرسید احمد خان' مقالات سرسید حصہ دہم' ص: ۱۱۴

۹- ڈاکٹر انور سدید' اردو ادب کی تحریکیں' ص: ۳۱۸

۱۰- ڈاکٹر سید عبداللہ' سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقا کی نثر کا فنی اور فکری جائزہ' سنگ میل لاہور' ۱۹۹۸ء' ص: ۱۳۸

۱۱- سرسید احمد خان' مقالات سرسید' مرتبہ: مولانا اسماعیل پانی پتی' مجلس ترقی ادب لاہور' اکتوبر ۱۹۶۲ء' ص: ۳۱۲

۱۲- ڈاکٹر سید عبداللہ' سرسید اور ان کے نامور رفقا کی نثر کا فنی اور فکری جائزہ' ص: ۱۸۵

۱۳- ریاض احمد' تنقید سرسید کے دور میں' مشمولہ اردو تنقید نگاری' مرتبہ: سردار مسیح گل' اردو لٹریچر کمپنی لاہور' فروری ۱۹۶۶ء' ص: ۲۸۳

۱۴- سید آل احمد سرور' یادگار حالی' مشمولہ احوال و نقد حالی' ص: ۴۸۹

۱۵- مولانا الطاف حسین حالی' مقدمہ شعر و شاعری' ص: ۲۶' ۲۷

۱۶- ایضاً، ص ۲۵، ۲۶
۱۷- ایضاً، ص ۲۸
۱۸- مولانا الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، ص: ۲۹
۱۹- سید محمد نواب کریم، حالی سے کلیم تک، ص: ۹۱
۲۰- ڈاکٹر عبادت بریلوی، اردو تنقید کا ارتقا، ص: ۱۲۳-۱۲۴
۲۱- مولوی عبدالحق، حالی کی تنقید، مشمولہ: احوال و نقد حالی، ص: ۳۱۲
۲۲- سید محمد نواب کریم، حالی سے کلیم تک، ص: ۱۰۳
۲۳- ڈاکٹر سید عبداللہ، سر سید احمد خان اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ، ص: ۱۴۰
۲۴- ڈاکٹر عبادت بریلوی، اردو تنقید کا ارتقا، ص: ۱۵۵
۲۵- نور الحسن نقوی، فن تنقید اور اردو تنقید نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۰ء، ص: ۱۲۱
۲۶- ڈاکٹر شارب ردولوی، جدید اردو تنقید اصول و نظریات، ص: ۲۹۵
۲۷- مولانا شبلی نعمانی، شعر العجم جلد چہارم، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور، س: ن، ص: ۵۹-۶۱
۲۸- ایضاً، ص: ۶۴
۲۹- ایضاً، ص: ۶۵
۳۰- ایضاً، ص: ۷۳
۳۱- مولانا شبلی نعمانی، شعر العجم جلد چہارم، ص: ۱۰۱
۳۲- ایضاً، ص ۱۰۶
۳۳- ایضاً، ص ۱۳۶-۱۳۸
۳۴- مفتون احمد، مولانا شبلی نعمانی ایک مطالعہ، مکتبہ اسلوب کراچی، ۱۹۸۶ء، ص: ۶
۳۵- مولانا شبلی نعمانی، مقالات شبلی جلد دوم، مرتبہ: مولانا سید سلیمان ندوی، نیشنل بک فاؤنڈیشن پاکستان اسلام آباد ۱۹۸۹، ص ۵۲-۵۳
۳۶- عبدالشکور، تنقیدی سرمایہ اردو میں، کتاب محل الہ آباد، ۱۹۴۶ء، ص: ۷۶
۳۷- مولانا شبلی نعمانی، شعر العجم جلد چہارم، ص: ۱۴۲-۱۴۳

۳۸- محمد واصل عثمانی، شبلی ادیبوں کی نظر میں، صبغہ اکیڈمی کراچی، نومبر ۱۹۶۸ء، ص: ۴۴
۳۹- ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، معروضات، پولیمر پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۸ء، ص: ۸۸
۴۰- مولانا محمد حسین آزاد، نیرنگ خیال، مرتبہ: ڈاکٹر محمد صادق، مجلس ترقی ادب لاہور، مئی ۱۹۹۸ء، ص: ۵۰
۴۱- مولانا محمد حسین آزاد، مقالات محمد حسین آزاد جلد سوم، مرتبہ: آغا محمد باقر، مجلس ترقی ادب لاہور، اپریل ۱۹۸۷ء، ص: ۱۰۲
۴۲- ڈاکٹر طیبہ خاتون، اردو میں ادبی نثر کی تاریخ (۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء) ص: ۱۴۰-۱۴۱
۴۳- مولانا محمد حسین آزاد، سخن دان فارس، مجلس ترقی ادب لاہور، جون ۱۹۹۰، ص: ۲۹۵
۴۴- ایضاً، ص: ۳۱۹
۴۵- ایضاً، ص: ۱۷
۴۶- ڈاکٹر آغا سہیل، معارف سہیل، اقبال بک کارنر لاہور، ۱۹۷۵ء، ص: ۱۴۲-۱۴۳
۴۷- محمد حسین آزاد، نظم آزاد، مرتبہ: تبسم کاشمیری، مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۷۸، ص: ۴۵